بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

زلزلہ: حادثۂ عظیمہ

کس قدر کرب انگیز ہے یہ سانحہ! اور کیسا جگر پاش اور روح فرسا ہے اس کا تصور!

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے

ذرا سوچئے کہ لاکھوں گھرانے جو اپنی چھت کے نیچے سکون واطمینان کے ساتھ سوئے تھے، صبح ہوتے ہی اس طرح خانماں برباد ہوئے کہ ہزاراں ہزار تو اپنی ہی چھت کے ملبے کے نیچے دب گئے اور جو بچ گئے ان کے پاؤں ٹکانے کو دھرتی نہ سر چھپانے کو چھپر۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں، کسی کو علم نہیں کہ کون بچا اور کون مر گیا اور جو بچا ہے وہ کس حالت میں ہے اور کہاں ہے۔ اس سے بڑھ کر قیامت خیز تباہی اور کیا ہو گی۔ ان لوگوں پر کیا بیتی ہو گی جن کا پورا خاندان اپنے ہی مکان کے ملبے میں دفن ہو گیا اور ایک آدھ گھر ہی نہیں بلکہ علاقے کا علاقہ ہی ملیا میٹ ہو گیا۔ **لا عاصم الیوم من امر اللہ** (۱۱/۴۳) ''آج اس ابتلاء سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی'' کا جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آ جائے، قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث کم آتے ہیں، لیکن قوم اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔ اس طرح کے طبعی حوادث زندہ اقوام پر بھی آتے ہیں۔ اول تو انہوں نے اپنی پیش بینی سے پہلے ہی احتیاطی وحفاظتی تدبیریں اختیار کر رکھی ہوتی ہیں اور اگر معاملہ ان کی حد سے بڑھ جائے تو پوری قوم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور متاثرین کو اس طرح سنبھال لیتی ہے کہ ان کو اپنے نقصان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حادثہ کے گزر جانے کے بعد عمائدین قوم سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں کہ ہماری تدابیر میں کیا کمی رہ گئی تھی اور اس کو آئندہ کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ متبوعین کو اس کا خیال ہے کہ ایسے حادثات وسانحات کا کوئی مستقل حل سوچنا چاہئے اور نہ تبعین کو اس کا احساس کہ زندگی کو کسی

ڈھب پر گذارنے کی شکل پیدا کرنی چاہئے۔ آج سے پچاس سال قبل ''طلوع اسلام'' نے انہی صفحات پر' سیلاب کے تباہی مچانے کے بعد' ان الفاظ میں اربابِ حل وعقد کے سامنے دردمندانہ گذارش کی تھی:

> ''اگر ہمارے ہاں خدمتِ خلق کے لئے ادارے موجود ہوں تو خدمت کا سلسلہ فی الفور شروع کیا جا سکتا ہے یہ ایسی کمی ہے جو ہمیں آفات وحوادث کے وقت بے چارا سا بنا دیتی ہے اور ہمارے نقصانِ جان و مال میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اگر اب بھی اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے اور ایسی (تربیت یافتہ کارکنان پر مشتمل) تنظیمیں قائم کر لی جائیں تو ملک کو بہت سے غیر ضروری مصائب سے بچایا جا سکتا ہے۔''

لیکن افسوس ہے کہ ہم آج بھی اسی مقام پر ہیں جہاں پر نصف صدی قبل کھڑے تھے۔

باقی رہے ہمارے مذہبی راہنما' سو جب کبھی اس طرح کے حوادث آتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان اور قوم کو تسکین دے لیتے ہیں کہ سب ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کہنے کو تو وہ ہمارے گناہ کہتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد ہوتی ہے اربابِ حکومت وقیادت کے گناہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی وہ طبقہ ہے جو فسق وفجور میں مبتلا رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے خدا کا عذاب آتا ہے۔ یہ خیال کہ طبعی حوادث' آندھیاں' سیلاب اور زلزلے خدا کا عذاب ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر نازل ہوتا ہے اس قدر عام ہے کہ اس سے متعلق اکثر ہم سے لوگ پوچھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا جاتا کہ فطرت کے حوادث کا علاج قوانین فطرت کے مطابق ہوتا ہے جس کے لئے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ برعکس اس کے قوم کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ ابتلا خدا کی طرف سے ہے اس لئے کوئی ان کی روک تھام نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبعی حوادث کو انسانوں کی نیکی اور بدی سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں کفر وایمان کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قطرینا و ریٹا کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ قرآن کریم نے تسخیر فطرت کو آدمی کے لئے عام بتایا ہے۔ **سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعاً**۔ یعنی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کا مخاطب آدمی ہے کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔ اس لئے دنیا کی جو قوم بھی چاہے تسخیر فطرت کر سکتی ہے' جو قوم ایسا کرے گی وہ طبعی حوادث کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گی نقصان اٹھائے گی۔

قرآن نے زندگی کی ایک سطح حیوانی بتائی ہے۔ حیوان فطرت کو تسخیر نہیں کر سکتا۔ ایک درجہ آدمیت کا ہے۔ آدمی تسخیر کر

سکتا ہے۔ تیسرا مقام مومن کا ہے جو متاعِ فطرت کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کرتا ہے۔ کوئی مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مقامِ آدم تک نہ پہنچ جائے۔ بقول اقبالؔ:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مقامِ مومن مشکل ہے تو ہمیں ان حادثات طبعیہ سے بچنے کے لئے کم از کم مقام آدمیت تک آنا پڑے گا یعنی تسخیر فطرت کی صلاحیت حاصل کرنی ہوگی اور اس کے لئے قومی کردار پیدا کرنا پڑے گا۔ ہمارے لئے یہ ہیبت انگیز اور خوف ناک زلزلہ فطرت کا ایسا اشارہ ثابت ہوسکتا ہے جس کو سمجھنے سے ہم اپنی تقدیر سنوار سکتے ہیں۔ ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے جس شعور اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جب اس سے اقوام آگاہ ہوتی ہیں تو ان کی اجتماعی زندگی کے مظاہر محیر العقول ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاء الحق قاسمی

نقار خانے میں طوطی کی آواز؟

آج کے ''جنگ'' میں شائع شدہ دو کالموں میں مجھے دو باتیں خصوصاً بہت اہم لگی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان زلزلہ زدگان کو جو کھلے آسمان تلے موسم کی شدت کے ہاتھوں مزید گھائل ہو رہے ہیں انہیں اسلام آباد میں لا کر آباد کیا جائے۔ میں اس تجویز میں کچھ مزید اضافے کرنا چاہتا ہوں مثلاً متاثرین کی آبادکاری مستقلاً نہیں کہ یہ تو وہ خود بھی پسند نہیں کریں گے اور نہ یہ کہ ان کے گھروں کی تعمیر تک انہیں اسلام آباد کے ایم این اے ہاسٹلز، کشمیر ہاؤس یا پنجاب ہاؤس میں رکھا جائے بلکہ انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ صرف موسم سرما کے لئے اپنے علاقوں سے ہجرت کر کے اسلام آباد آ جائیں۔ اس دوران تعلیمی ادارے چند ماہ کے لئے بند کر دیئے جائیں اور ان میں ان متاثرین کو رکھا جائے۔ متاثرین کی اسلام آباد منتقلی ان ٹرکوں اور ٹرانسپورٹ کے دوسرے ذرائع سے کی جا سکتی ہے جو امدادی سامان لے کر وہاں جا رہے ہیں۔ وہ واپسی پر ہر پھیرے میں ہزاروں مصیبت زدگان کو واپس لا سکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ لوگ موسم کی شدت سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ شہریوں کی امدادی ٹیموں کو ان علاقوں تک کا دشوار گزار سفر بھی طے نہیں کرنا پڑے گا۔ متاثرین کو فوری اور مؤثر طبی امداد ملنا بھی ممکن ہو جائے گی۔ ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لئے پاکستان کے لاکھوں اہل دل ان کے قریب ہوں گے اور حکومت کی بہت سی ''دردسری'' بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ متاثرین کو اسلام آباد آنے پر مائل کیا جائے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً ہمارے لوگ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنا علاقہ چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ دوسرے وہ اپنے اپنے مکانوں کے ملبے پر بیٹھے اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب یہ ملبہ ہٹایا جائے گا اور ان کے عزیزوں کی لاشیں اس میں سے نکالی جا سکیں گی تاکہ وہ ان کی تدفین کر سکیں۔ کچھ لوگ اس لئے بھی منتقلی پر راضی نہیں ہوں گے کہ ان کا سب کچھ ملبے

تلے دبا پڑا ہے جس میں وہ قیمتی سامان بھی ہوسکتا ہے جس کے ملنے کی انہیں امید ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے لاکھوں متاثرین فوری طور پر اس آسیب زدہ علاقے سے نکلنا چاہیں گے۔ سو حکومت سے میری درخواست ہے کہ وہ اس تجویز پر غور کرے اور اگر اس پر عمل پیرا ہونے میں کچھ مشکلات ہیں تو ان کا ازالہ کر کے اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے لاکھوں لوگوں کی جانیں اب بھی بچائی جاسکتی ہیں۔

دوسری اہم بات جو مجھے ایک کالم میں نظر آئی وہ اس سوال کی صورت میں ہے کہ کیا زلزلے کے شدید جھٹکوں نے گنہگاروں کے ضمیر کو کچوکے دیئے؟ ہر روز ہزاروں ہم وطنوں کی لاشیں، سینکڑوں زخمیوں کو دیکھ کر کیا بدعنوانوں کے دل کانپے؟ کیا کوئی ذخیرہ اندوز سامنے آیا اور اعتراف کیا کہ میں نے دولت کی ہوس میں لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کی بجائے اشیائے خوردنی جمع کیں اور منہ مانگے داموں فروخت کیں۔ اب آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ کالم میں یہی سوال کرپٹ اور بے ضمیر راشی افسروں، ٹھیکیداروں، راہنماؤں سیاست دانوں، سابق وموجودہ حکمرانوں، مذہبی پیشواؤں اور صنعت کاروں کے حوالے سے بھی دہرایا گیا ہے! یہ میرا گمان نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی کا ضمیر بھی ملامت نہیں کرے گا۔

کیونکہ ان لوگوں سمیت ہم سب کو بتایا گیا ہے کہ گناہ کبیرہ میں صرف شرک، سود، جواء، زنا اور شراب شامل ہیں جن معاشرتی گناہوں کی طرف کالم نگوار نے اشارہ کیا ہے وہ ''علماء'' کے نزدیک ''گناہ کبیرہ'' کی ذیل میں نہیں آتے۔ یہ چھوٹے موٹے گناہ ہیں اور اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ ابھی گزشتہ روز ایک ٹی وی چینل کے مذہبی پروگرام میں اس کی خاتون کمپیئر نے مختلف مسالک کے تین علماء سے گناہ کبیرہ کے بارے میں سوال پوچھا تو تینوں نے زنا اور شراب خوری وغیرہ ہی کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا تھا۔ وہ بے چاری ہر بار ان علماء کو گھیر گھار کر معاشرتی گناہوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتی لیکن وہ اس کی باتوں میں کہاں آنے والے تھے۔ سو ہم سب کو یقین رکھنا چاہئے کہ بڑے سے بڑا زلزلہ بھی معاشرتی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکے گا کیونکہ معاشرتی جرائم کے مرتکب ضمیر کی خلش میں مبتلا ہی نہیں ہیں چنانچہ وہ ماضی کی طرح آئندہ بھی اپنے جرائم کا ارتکاب جاری رکھیں گے کہ ان کے نزدیک یہ سارے جرائم ایک عمرے کی مار ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'')

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذیر ناجی

کیا یہ فطرت کا قصور ہے؟

اگر دریا کے کنارے آباد ملاح، کشتی نہ ہونے کی وجہ سے سیلاب میں ڈوب جائے۔ بلند پہاڑوں پر آباد کوئی خاندان گھر میں جلانے کی لکڑی نہ ہونے کی بنا پر، سردی میں ٹھٹھر کے مرجائے اور صحراؤں میں رہنے والا کوئی شخص پانی کا برتن نہ ہونے کی وجہ سے پیاسا مرجائے تو یہ فطرت کا نہیں، ہلاک ہونے والوں کا قصور ہے۔ یقیناً انسان قدرتی آفات کے سامنے بے بس ہے۔ وہ انہیں روک نہیں سکتا مگر ان سے بچنے کی تدبیر ضرور کرسکتا ہے۔ 1906ء میں سان فرانسسکو ریکٹر سکیل پر 8.8 سے بڑے زلزلے کا شکار ہوا مگر صرف تین ہزار افراد ہلاک ہوئے جبکہ اس کی آبادی مظفر آباد سے کئی گنا زیادہ تھی۔ 1999ء میں تائیوان کا زلزلہ بھی پاکستان کے حالیہ زلزلے سے زیادہ شدید تھا مگر اس میں صرف 2300 افراد ہلاک ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں تعمیرات کے مقررہ اصولوں کی سختی سے پابندی کرائی جاتی ہے۔ فوری امداد کے مناسب انتظامات رکھے جاتے ہیں۔ ہنگامی حالات سے نمٹنے کی مناسب تیاریاں ہوتی ہیں۔ اس طرح انسان فطرت کے سامنے بے بس ہونے کے باوجود اپنے بچاؤ کی ممکنہ تدبیریں اختیار کر کے تباہ کاریوں کے اثرات کو کم کر لیتا ہے۔

کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان میں حالیہ زلزلہ اچانک اور کسی پیشگی اطلاع کے بغیر آیا۔ چار سال پہلے ماہرین انتباہ کر چکے تھے کہ اس علاقے میں ایک شدید زلزلے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، جو کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ اس رپورٹ کو چھوڑیئے۔ جب اسلام آباد بسانے کا فیصلہ ہوا تو مختلف ماہرین ارضیات نے صاف بتا دیا تھا کہ یہ علاقہ شہر بسانے کے لئے خطرناک ہے۔ نئے دارالحکومت کی تعمیر و ترقی سے تعلق رکھنے والی کئی جلدوں پر مشتمل فائل میں یہ رپورٹ موجود ہے۔ اس میں انتباہ کیا گیا ہے کہ جس علاقے کو شہر بسانے کے لئے منتخب کیا گیا ہے، وہ زلزلے کی فالٹ لائن پر واقع ہے۔ امریکی انجینئر اور ٹاؤن پلانر ایڈورڈ سٹون نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ زمینی ساخت اور پتھروں کا تجزیہ ظاہر

کرتا ہے کہ یہ علاقہ بڑے شہر کی تعمیر کے لئے مناسب نہیں کیونکہ یہاں بڑی عمارتیں تعمیر کرنا خطرے کا باعث ہوگا اور کسی بھی وقت بڑا زلزلہ ان کو تباہ کرسکتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ یہ علاقہ پانی کی قلت کا شکار ہے اور کسی بڑے شہر کی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ اس کے باوجود ایوب خان نے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اسلام آباد کی آبادکاری کا حکم دے دیا۔ ایوب خان کا منصوبہ یہ تھا کہ اسلام آباد کی آبادی 80 ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن اب یہ قریباً سات لاکھ سے زیادہ ہوچکی ہے اور جس تیزی سے اس کے گردونواح میں تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے' اسے دیکھ کر خیال کیا جاتا ہے کہ ایک عشرے تک یہ آبادی ڈیڑھ ملین کے قریب چلی جائے گی۔ تعمیراتی ماہرین نے یہ رائے بھی دی تھی کہ اس علاقے میں تین منزلوں سے زیادہ اونچی عمارتیں تعمیر نہ کی جائیں کیونکہ ساخت کے اعتبار سے اسلام آباد کی زمین بلند عمارتوں کی بنیادیں برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہاں دس پندرہ منزلوں کی عمارتیں تعمیر کرنے کی کھلی اجازت دی گئی اور جونئی بستیاں آباد ہورہی ہیں' ان کے اشتہاروں میں بیس پچیس منزلہ عمارتوں کی تعمیر کے اعلانات کئے جارہے ہیں۔

اس پس منظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام آباد اور اس کے گردونواح میں زلزلے کی تباہ کاریوں سے بچنے کے مکمل انتظامات ایک لازمی ضرورت ہیں۔ جب ماہرین ارضیات کی تجزیاتی اور مشاورتی رپورٹوں کے باوجود یہ شہر آباد کرنے پر اصرار کیا گیا تو لازم تھا کہ آبادکاری کے ساتھ زلزلوں سے بچاؤ کی مکمل تدابیر اختیار کی جاتیں۔ تمام عمارتیں زلزلے سے بچاؤ کی جدید ترین ٹیکنالوجی کے مطابق بننا چاہئے تھیں۔ کوئی عمارت تین منزلوں سے بلند نہیں ہونا چاہئے تھی۔ زلزلے سے بچاؤ کے لئے ہر آبادی کے قریب کھلے میدان موجود ہونا چاہئیں تھے۔ زلزلے سے آنے والی تباہی کے متاثرین کی فوری امداد کے لئے ہنگامی ضروریات کی ہر چیز' ہر وقت تیار رکھنے کا انتظام ہونا چاہئے تھا۔ ایک ملاح دریا پر جھونپڑا بناتے وقت اپنے پاس کشتی ضرور رکھتا ہے۔ صحراؤں میں رہنے والے پانی ذخیرہ کرنے کا انتظام ضرور رکھتے ہیں۔ برفانی علاقوں کے باشندے اپنے گھروں میں جلانے کی لکڑی ضرور ذخیرہ کرتے ہیں۔ جب عام اور علم ومہارت سے محروم لوگ اتنی عقل رکھتے ہیں تو ایک شہر آباد کرنے والی حکومت' جسے ہر طرح کے ماہرین کی راہنمائی حاصل تھی۔ اس نے زلزلے کے علاقے میں شہر بساتے وقت بچاؤ کی تدابیر کیوں اختیار نہ کیں؟ کیا یہ بھی فطرت کا قصور ہے؟ اگر ماہرین کی رپورٹوں کے مطابق اس پورے علاقے میں زلزلے سے بچاؤ کی تدابیر کرلی جاتیں تو چالیس سال کے عرصے میں کیا کچھ نہیں ہوسکتا تھا؟ اول تو یہ کہ

دارالحکومت کی تعمیر کے لئے علاقے کا انتخاب ہی محفوظ جگہ پر کیا جاتا۔ کراچی کے نزدیک نیا شہر بسانے میں کیا قباحت تھی؟ اور اگر اسلام آباد آباد کرنا ہی مطلوب تھا تو پھر منتخب علاقے کی ضروریات کے مطابق بچاؤ کی تدابیر کیوں نہیں کی گئیں؟ سرحد اور آزاد کشمیر کے جو علاقے اس قدر ہولناک تباہی کی لپیٹ میں آئے۔ گزشتہ چالیس برسوں کے دوران وہاں کا تعمیراتی نقشہ بدلا جا سکتا تھا۔ بے شک زلزلہ ایک قدرتی آفت ہے لیکن اس قدر انسانی جانوں کا نقصان انسانی نااہلی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ جس شہر کی آبادکاری کے وقت ماہرین نے علاقے میں بڑے زلزلوں کی آمد کا انتباہ کیا ہو۔ وہاں وقت آنے پر ملبے کے نیچے آنے والوں میں زندگی تلاش کرنے والے آلات بھی دستیاب نہ ہوں۔ بالاکوٹ میں ایک سکول کا ملبہ اٹھانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں کہ فرانسیسی امدادی ٹیم کے لوگوں نے آلات کے ذریعے پتہ لگا کر بتایا کہ اندر زندہ بچے موجود ہیں۔ انہوں نے اصرار کر کے ملبہ اٹھانے والوں کو روکا اور ایک سرنگ لگا کر چالیس زندہ بچے برآمد کر لئے۔ اس ایک واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زلزلے نے اتنے لوگوں کی جان نہیں لی، جتنے لوگ ہماری نااہلی کی وجہ سے لقمہ اجل بنے۔ ابتدائی ہنگامی اقدامات کا مرحلہ ختم ہوتے ہی صدر اور وزیر اعظم کو سائنسی بنیادوں پر طویل مدتی منصوبہ بندی کا انتظام کرنا چاہئے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'')

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقبول محمود فرحت، لندن

قوموں کی تباہی کے اسباب

اس مضمون میں اقوام سابقہ کے حالات (تاریخ اقوام) کو جو قرآن کریم میں مختلف مقامات میں بیان کئے گئے ہیں اکٹھا کر کے تصریفِ آیات کے اصول کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔

تاریخ انسانیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بے شمار تہذیبوں نے جنم لیا، پروان چڑھیں، قوت، عظمت، شوکت وحشمت کے بام عروج پر پہنچیں اور اپنی ہم عصر اقوام پر غالب رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ روبہ زوال ہو کر نیست و نابود ہو گئیں اور اب ان کے کھنڈرات اور آثار قدیمہ آنے والی قوموں کے لئے وجہِ عبرت ہیں۔

ہم پاکستانی آزادی کے ۵۸ سال بعد بھی ترقی کے بجائے زوال پذیر کیوں ہیں۔ ہم پاکستانی مسلمان ہیں۔ ہمیں حامل قرآن ہونے کا دعویٰ بھی ہے لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ قرآن حکیم اقوام کے عروج وزوال کے کیا اسباب وعلل بتاتا ہے۔ اس نے قوموں کی حیات وموت کے کیا اٹل غیر متبدل قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور تباہی سے بچنے کے لئے کیا راہنمائی دیتا ہے؟

قرآن حکیم سابقہ قوموں کی تاریخ کے مطالعہ پر بہت زور دیتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہو گا کہ اسلام پہلا دین ہے جس نے تاریخ History کو ایک سائنس کے طور پر پیش کیا ہے۔ بے شمار آیات اس موضوع پر قرآن میں بکھری پڑی ہیں مگر طوالت کے خوف سے صرف چند ایک پر اکتفا کیا گیا ہے اور ان کا صرف مختصر مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ عربی متن خود قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ سورت اور آیت کا نمبر یوں ہے مثلاً ۲:۳۵ کا مطلب سورت نمبر۲ البقرہ آیت نمبر ۳۵ ہے۔

سنت اللہ: قرآن کریم کا فرمان ہے کہ خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا۔ ہر واقعہ اور اس کا نتیجہ قوانین قدرت Physical Laws کے تحت ہوتا ہے اور یہ خدائی قوانین (سنت اللہ) غیر متبدل (immutable) ہیں۔ مثلاً آگ جلتی جلاتی ہے وہ کبھی ٹھنڈک نہیں پہنچائے گی۔ پانی ۱۰۰ سینٹی گریڈ پر ابلتا ہے اور صفر سینٹی گریڈ پر جم جاتا ہی۔ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ رتی بھر

وزن کی سوئی پانی میں ڈوب جاتی ہے جبکہ ہزاروں ٹن لوہے کا بحری جہاز۔ آئل ٹینکر سمندر میں تیرتا ہے۔

انسانی دنیا: اسی طرح انسانی دنیا میں اچھی یا بری تبدیلی بلا سبب رونما نہیں ہوتی اس کے لئے بھی اللہ کی طرف سے اٹل غیر متبدل قوانین مقرر ہیں جو بذریعہ وحی انسانوں کو انبیاء کے ذریعے بتا دیئے گئے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنے زمانے کے حالات حاضرہ کو مدنظر رکھ کر اپنا نظام زندگی چلاتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور کاروان انسانیت کو آگے لے جاتی ہے اور ان قوانین الٰہی کی خلاف ورزی سے زوال پذیر ہو کر آخر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

ان قوانین قدرت کی صداقت کے ثبوت میں قرآن نے اقوام سابقہ کی داستانوں یعنی تاریخ کو بطور شہادت پیش کیا ہے کہ دیکھو فلاں قوم نے اس قسم کا حیات بخش نظام قائم کیا تو زندگی شادابیوں اور سرفرازیوں کا آئینہ دار بنی اور فلاں قوم نے غلط نظام قائم کیا تو کس طرح تباہ و برباد ہو گئی۔

اللہ کی یہ کتاب قرآن حکیم تا قیامت مشعل ہدایت ہے لہٰذا وہ ملت اسلامیہ یعنی مسلمانوں (ان میں ہم پاکستانی مسلمان بھی شامل ہیں) کو یوں مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں پہلے ہو گذری ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟ کچھ عرصہ کی درخشندگی، خوش حالی نے حقائق کو آنکھوں سے اوجھل رکھا مگر اب ان کی تابناک داستانیں تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں ہیں۔ (۸۳۔۸۲:۴۰، ۱۱۔۶:۱۰)۔ تفصیل تو طویل تر ہے تاہم اس مضمون میں چند جرائم کی فہرست پیش خدمت ہے جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں بغور مطالعہ سے مسلمان بشمول اہل پاکستان اس آئینے میں اپنا اصلی چہرہ دیکھ لیں۔

طبقاتی تفریق: جب کسی سوسائٹی میں طبقاتی تفریق Class System پیدا ہو جائے۔ عزت و احترام کا معیار دولت بن جائے۔ محنت کش مزدور، مزارع، غریب شخص کو نیچ ذات کا حقیر انسان تصور کیا جائے جیسا قوم نوح میں تھا۔ (۱۱۶، ۲۶:۱۱۱۔ ۱۷:۷۰۔ ۱۱:۲۷)۔

معیار قومیت: جب ایمان، نظریہ زندگی کے بجائے رنگ، خون، نسل، زبان قرار پائے یعنی Racism۔ یہ اہم نقطہ بھی تذکرہ حضرت نوحؑ میں سامنے آتا ہے جب انہوں نے اللہ سے اپنے ڈوبتے بیٹے کو بچانے کی دعا کی تو اللہ نے کہا کہ ایمان کے عدم اشتراک کی وجہ سے وہ تیرے اہل سے نہ رہا ۱۱:۴۱۔ دو قومی نظریہ اسی سے جنم لیتا ہے۔ جنگ بدر میں ایک ہی شہر مکہ کے باشندے ایمان۔ نظریہ زندگی کی بنا پر مسلم و مشرک کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

سلب ونہب: جو قوم ظلم وستم اور آمریت سے حکومت کرے اور استحصال (Exploitation) کرے خواہ وہ قوت۔ تہذیب وتمدن کی کتنی بلندیوں پر کیوں نہ ہو آخر تباہ ہوتی ہے یہ

حقیقت قوم عاد کی سرگزشت میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ (۲۶:۴۶۔۱۹۔۱۷:۵۹۔۱۱:۱۸۔۸۹:۱۸)۔

جاگیرداری: جس قوم میں جاگیرداری نظام (Feudalism) ہو اور ذرائع پیداوار (یعنی اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے) کھلے نہ رکھیں جائیں۔ معیشت (Economy) پر چند افراد (بائیس خاندانوں) کی اجارہ داری ہو۔ قوم ثمودؑ قوم صالح کی داستان اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ (۱۵۴۔۱۵۲:۲۷۔۸۳۔۸۲:۱۵۔۷۵۔۷۳:۷)۔

سرمایہ داری: جس قوم کا کاروبار۔ تجارت سرمایہ داری (Capitalism) پر ہو یعنی مزدور۔ مزارع۔ صارف (Consumer) کو جتنا جی چاہے لوٹا جائے۔ سرمایہ کے زور پر دوسروں کی کمائی کو ہتھایا جائے اس کا فطری نتیجہ ارتکاز زر (Wealth in few hands) ہوتا ہے وہ قوم پنپ نہیں سکتی۔ یہ بات حضرت شعیبؑ کی قوم کے قصہ سے معلوم ہوتی ہے۔ (۹۲۔۸۴:۱۱۔۸۶۔۸۵:۷)۔

دنیاوی زندگی: جو قوم محض اس دنیا کو ہی اپنا منتہا سمجھ لے کہ جس کے ساتھ انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور آخرت پر ایمان نہ ہو اور ہو بھی تو رسمی' جیسا ہم مسلمانوں کا ہے وہ نظریہ حیات آخرکار تباہی کا موجب بنتا ہے۔ مثلاً نظریہ اشتراکیت اور مادیت (Materialism)۔ (۱۵:۵۰۔۱۰:۳۲۔ ۳۸۔۳۵:۲۳)۔

تسخیر کائنات: جو قوم تسخیر کائنات کے اہم فریضہ سے غافل رہتی ہے وہ یہاں بھی اندھی اور آخرت میں بھی اس کے حصہ میں کچھ نہ ہوگا ایسی قوم مومن تو درکنار وہ مقام آدمیت تک بھی نہیں پہنچ پاتی اور ہمیشہ ذلیل و خوار رہتی ہے جیسی ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت ہے۔ اللہ نے نظام فطرت پر غور و فکر کرنے' کائنات کے چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کرنے اور ان کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال میں لانے پر بار بار تاکید کی ہے۔ (۲۰۔۱۷:۸۸۔ ۷۶۔۵۶:۶۲۔ ۹۔۸:۳۰۔ ۱۰۱:۱۰۔۱۹۱:۳)۔

جنسی بدنہادی: جو قوم اخلاقی قدروں (Moral Values) کو بھول جائے۔ جنسی بے راہ روی (Permissiveness)۔ حرام خوری' اغلام بازی (Sodomy)' ہم جنس پرستی (Gay+Lesbian) عام ہو جائے اور اسے قابل نفرت نہ سمجھا جائے وہ دو تین نسلوں کے بعد پھر قوم نہیں رہتی۔ اس کی شہادت قوم لوط کے عبرتناک واقعہ سے ملتی ہے۔ (۲۹۔۲۸:۲۹۔ ۵۵۔۵۴:۲۷۔ ۸۲۔۷۸:۱۱۔۸۴۔۸۰:۷)۔

سہل انگاری: جو قوم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت نہ کرے۔ ہتھیار بند چوکس نہ ہو وہ غیروں کی بالادستی سے محفوظ نہیں رہتی۔ دوسروں سے امید رکھے کہ وہ اس کی مدد کو آئیں وہ قوم اپنی سہل انگاری کی وجہ سے ہمیشہ غیر

اقوام کے رحم وکرم سے زندہ رہتی ہے۔ یاجوج ماجوج ہر وقت دھاوا بولتے رہتے ہیں۔ آج کے دور میں کویت کو امریکہ اور بوسنیا کو یورپین یونین نے اپنے مقاصد کی خاطر سانس لینے کی اجازت دے رکھی ہے۔ حضرت ذوالقرنین کے واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ (۹۸۔۹۳:۱۸)۔

ڈکٹیٹر شپ اور مذہبی پیشوائیت: جس قوم کو آمریت، بادشاہت کے ساتھ مل کر مذہبی پیشوائیت اپنے پنجوں میں جکڑ لے جیسا زمانہ فرعون میں قوم بنی اسرائیل سے ہوا تھا وہ پست تر رہتی ہے۔

فرعون: ملوکیت یعنی ڈکٹیٹر شپ کا مجسمہ۔ تمام اختیارات کلی (Absolute Powers) فرد واحد کے ہاتھ میں۔ قانون سے بالاتر۔ ملک میں پارٹیاں بنا کر ان کو آپس میں لڑانا۔ فرزندان قوم جن میں جوہر مردانگی ہوں انہیں ذلیل و خوار کرنا۔ کچل دینا۔ اور خوشامدیوں کو مقرب بنانا۔ مراعات و انعامات سے نوازنا، اپنے لامحدود اختیارات کو جائز اور آئینی قرار دینے کے لئے مذہبی ٹھیکیداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ جیسا کہ پاکستان میں ۲۵ سال قبل ایک نام نہاد مردحق مردمومن کی اس مذموم حکمت عملی کا نتیجہ آج قوم بری طرح بھگت رہی ہے۔

ہامان: اور ان مذہبی علمبرداروں کی خود ساختہ شریعت کے مطابق کروڑوں، اربوں روپیہ کی ناجائز حرام کمائی سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینے سے اس دولت کو جائز قرار دینے کا سرٹیفکیٹ (فتویٰ) دینا بلکہ ان خون آشام امراء، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کو جنت میں محلوں کی بشارت دینے اور غریبوں کو ''تقدیر کا لکھا'' سنا کر افیون کی گولیاں کھلا کر سلائے رکھنا اور یہ وعظ کرنا کہ یہ دنیا کتوں کے لئے ہے تم یہاں غریب ہو تو کوئی بات نہیں مگر آخرت میں سب کچھ تمہارا ہے، اس مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہامان ہے۔

قارون: سرمایہ دار نچلے طبقہ کا خون چوستا ہے۔ یہ پہلا طبقہ جاگیردار ہو۔ وڈیرہ ہو یا کارخانہ دار۔ سمگلر ہو یا کچھ اور۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم۔ غریب کا آخری قطرہ خون چوسنے والا نظام قوم کو لے ڈوبے گا۔ اس نظام کا علمبردار قارون ہے۔ (۴:۱۶۱۔ ۳۰۔۲۹:۴۔ ۳:۱۰۳۔ ۲:۸۵۔ ۲۱۱، ۱۲۲، ۲:۴۰۔ ۲۰۔۸۹:۱۵۔ ۲۸:۷۷۔ ۲۸:۴۔۳۵۔۹:۳۴)۔

ان مندرجہ بالا آیات سے ان تینوں طبقوں کی تفصیل داستان بنی اسرائیل سے ملتی ہے۔

قوم بنی اسرائیل کا غلامی سے نکل کر مفت میں آزادی (نعمت الٰہی) ملنے کے بعد ان کی ذہنی۔ نفسیاتی۔ معاشرتی کیفیت اور اس کے عبرت ناک مظاہرے کس طرح ہمارا انگریز کی غلامی سے نکل کر آزادی سے ہمکنار ہونا اور آزادی کے بعد ہماری موجودہ حالت عین ہو بہو عکس ہیں، صرف زماں اور مکاں کا فرق ہے۔ ورنہ یہ خود تحریک پاکستان ہماری اپنی کہانی ہے۔ کس طرح ایک مردمومن مردحق (علامہ

اقبال) کی قرآنی بصیرت و فراست اور ایک مرد مجاہد (قائداعظم محمد علی جناح) کی سیاسی بصیرت نے مسلمانان ہند کو ہندو کی غلامی سے نکال کر ارض پاکستان کا وارث بنایا مگر خدا کی اس نعمت عظمیٰ کا اپنی بداعمالیوں سے ہم نے جو حشر کیا ہے وہ وجہِ صد عبرت ہے۔ لہٰذا قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مندرجہ بالا خرابیاں ہمارے ہاں تو نہیں پیدا ہوگئیں؟ ان کی روشنی میں ہم خود فیصلہ کریں۔ حقائق اس قدر روشن اور معیار اتنا صاف اور واضح ہے کہ کسی انکوائری کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں۔

ان مندرجہ بالا جرائم میں کوئی ایک جرم ایسا بھی ہے جو معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو۔ اگر ہماری حالت یہی رہی اور ہم موجودہ نظام زندگی نہ بدلیں تو کیا دنیا کی کوئی طاقت ہمیں تباہ ہونے سے بچا سکتی ہے؟ ایک مغربی مفکر رابرٹ برفو R.Briffault اپنی کتاب Making of Humanity میں لکھتا ہے:

''انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے وہ نظام تہذیب جس میں حق صداقت۔ ابدی حقائق کو نظر انداز کر دیا جائے وہ ہر حالت میں تباہ ہو کر رہتا ہے''۔ (بحوالہ انسان نے کیا سوچا؟ غلام احمد پرویز؛ صفحہ ۳۱۶)۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خادم ملکؔ (اوسلو ناروے)

لوٹے کو بھول جایئے

انٹرنیٹ پر ''جنگ'' کی ویب سائٹ میں اس اشتہار پر نظر پڑی ''لوٹے کو بھول جایئے'' یہ اشتہار ایک چھوٹے سے مستطیل خانے میں ٹمٹمارہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس اشتہار کو پڑھتا۔ خیال آیا کہ یہ اشتہار ضرور سیاسی لوٹوں کے بارے میں ہے۔ لگتا ہے سب لوٹوں میں اتحاد ہوگیا ہے اور تعداد میں اتنے ہوگئے ہیں کہ مزید لوٹوں کی ضرورت نہیں رہی، اسی لئے اشتہار دیا گیا ہوگا کہ لوٹوں کو بھول جایئے۔ پھر خیال آیا کہ ان بظاہر اچھے بھلے انسانوں کو لوٹے سے تشبیہہ کیوں دی جاتی ہے۔ اس سے پہلے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی کوشش کی۔

ذہن میں ایک دم قرآن کریم کے الفاظ آئے تَتَفَکَّرُو :سوچا کرو! خیال آیا سوچنے سے ہوسکتا ہے کچھ حاصل ہو جائے۔ کچھ حاصل نہ ہوا تو کم از کم الفاظ کی تلاوت سے ثواب تو مل جائے گا۔

اللہ کا نام لیکر سوچنا شروع کیا کہ ان سیاسی لوگوں کو لوٹا کیوں کہا جاتا ہے اور ان میں قدر مشترک کیا ہے؟ ایک مشترک قدر یہ ملی کہ لوٹا کسی ایک کا نہیں ہوتا وہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسی کا ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کس کا لوٹا ہے؟

اسی لئے ایسے سیاسی لوگوں کو لوٹا کہتے ہیں کہ ان کی کامیابی کسی پارٹی سے ہوتی ہے اور ہمدردیاں کسی اور پارٹی کیساتھ۔ اس لئے جہاں سے اسے کسی لالچ کی بُو آئے ادھر کو دوڑ جاتا ہے۔ کبھی وزارت کا لالچ، کبھی مال کا لالچ اور کبھی ٹھیکے کے لالچ کی وجہ سے مارا مارا پھرتا ہے۔ اتنی تو سمجھ آ گئی لیکن پھر بھی اسے لوٹے کیساتھ تشبیہہ کیوں دی جاتی ہے۔ اصلی لوٹے میں یہ خصوصیت ضرور ہے کہ وہ ہر کسی کا ہو جاتا ہے لیکن اس میں کسی قسم کا لالچ نہیں ہوتا اور وہ تو یہ سب خدمتِ خلق کے تحت کرتا ہے۔

بیوی سے پوچھا کہ میں نے تَتَفَکَّرُو کی رُو سے سوچ بچار کی ہے لیکن معلوم نہیں اس کا ثواب ملتا بھی ہے کہ نہیں۔ اس نے فوراً جوب دیا اور کہا کہ آپ نے قرآن کے ان الفاظ پر عمل کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کو اس چیز کا علم حاصل

ہوگیا جس کے لئے آپ نے سوچ بچار کی۔ یہی تو ثواب ہے۔ کسی بھی عمل کا نتیجہ اس کا ثواب ہوتا ہے۔ اس فلسفیانہ جواب کی توقع نہ تھی، لیکن جواب معقول تھا تسلیم کرنا پڑا۔

یعنی کسی بھی عمل کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اس عمل کا ثواب ہوتا ہے۔ جیسے صبح کی سیر کا نتیجہ اچھی صحت اس کا ثواب ہے۔ سارا دن مزدوری کرنے سے شام کو جو معاوضہ ملتا ہے وہ اس مزدوری کا ثواب۔ اچھے عمل کا اچھا نتیجہ اور بُرے عمل کا بُرا نتیجہ۔

اب آیئے اس اشتہار کی طرف اور دیکھیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اشتہار پر کلک کیا تو راز کھُلا، لکھا تھا:

''لوٹے کو بھول جایئے اور اسلامی شاور استعمال کیجئے''۔

لوٹے اور اسلامی شاور کی تصویر بھی تھی۔ تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماشااللہ گھر میں ایک نہیں دو دو اسلامی شاور ہیں، وہ بھی کافی عرصہ سے۔ یورپ میں بالخصوص ناروے میں اکثر مسلمانوں کے گھر لوٹے کی جگہ یہی اسلامی شاور نظر آتے ہیں، جو کافی عرصہ سے زیرِ استعمال ہیں۔ اشتہار پڑھ کر اُس غیر اسلامی، بے ایمان اور کافر کے لئے دل سے دُعا نکلی جس نے اسلامی شاور ایجاد کر کے ہمارے لئے آسانی کا سامان پیدا کیا۔

ایمانی ترازُو: اس سے قبل بلکہ اب بھی بڑی تعداد میں عام ترازُو پاکستان میں نظر آتے ہیں۔ آپ جب بھی کبھی پنساری کی دوکان پر جائیں، خشک میوہ، تازہ پھل یا سبزی خریدیں تو اس ترازو سے واسطہ پڑتا ہے۔ دل دھڑکتا ہے کہ دوکاندار کہیں ڈنڈی نہ مار دے۔ سنار کی دوکان پر جانے سے خوف اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ ظالم نے اگر ایک رتی کی بھی ڈنڈی ماردی تو کئی کلو فروٹ یا آٹے دال کا نقصان ہوجائے گا۔

پاکستان میں یہ ترازُو جب پہلی بار خاص طور پر سنُار کی دوکانوں پر آئے تو اس کا نام ''ایمانی کنڈا''، یعنی ایمان دار ترازُو پڑ گیا۔ گویا یہ تسلیم کرلیا گیا کہ اس سے پہلے والے کنڈے یا ترازُو بے ایمان تھے۔ حالانکہ ترازُو نہ ایمان دار ہوتا ہے نہ بے ایمان وہ تو استعمال کرنے والا ایماندار یا بے ایمان ہوجاتا ہے۔

اس ایمانی کنڈے کو دیکھ کر پھر دل کی گہرائیوں سے اُس بے ایمان کے لئے دُعا نکلی جس نے ایمانی کنڈا تیار کر کے ہم پر احسان کیا۔

ابھی اپنی بات ختم کرنے ہی والا تھا کہ ایک بزرگ نے کہا ''عجیب بات ہے کہ تم بے ایمان اور کافروں کے لئے بھی دُعا کرتے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیئے۔'' اس سے پہلے کہ میں بزرگ کی بات کا جواب دیتا مجھے مولوی صاحب کی بات یاد آ گئی۔ ایک جنازے میں تھے۔ میّت کے دفنانے کے بعد دُعا کا وقت تھا۔ دُعا مانگنے سے پہلے مولانا صاحب کفّار کی

قبروں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ہم اُن کے لئے دُعا نہیں مانگ سکتے۔ تھوڑی دُور کھڑے ایک صاحب آہستہ سے بولے کہ جن کے لئے آپ دُعا کر رہے ہیں معلوم نہیں ان کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہو۔ یہ تو ضمنی بات تھی۔

میں نے اس محترم بزرگ سے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں بے شرمی کی کوئی بات نہیں دُعا کرنا کوئی شرم کی بات نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ مساجد میں ہر روز لاکھوں لوگ کشمیر کی آزادی کی دُعا مانگتے ہیں، آزاد ہوا؟ فلسطین کی آزادی کی دُعا مانگتے ہیں آزاد ہوا؟ اسرائیل کی تباہی و بربادی کی دُعا مانگتے ہیں تباہ ہوا؟ یا اللہ تمام بیماروں کو شفا دے۔ شفا ملی؟ یا اللہ سب مسلمان بہن بھائیوں کو نیک بنا۔ نیک بنے؟ اگر ان لوگوں کی دُعائیں قبول نہیں ہوتیں تو میری دُعا کیا کرلے گی؟ اس لئے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بزرگ نے لاحول ولاقوۃ کہا، منہ بسورا اور چل دیئے۔

ویسے ہماری دُعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ تَتَفَکَّرُو آپ بھی سوچیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ممتاز احمد

بدمعاش کون؟

لفظ بدمعاش سُنتے ہی اکثریت کے ذہن میں ایک غنڈے کی تصویر بنتی ہے۔ جو دنگا فساد کرتا ہے‘ پولیس کچہری والوں سے اس کی دوستی ہوتی ہے‘ ہر شریف انسان اس سے ڈرتا ہے۔ وہ چوری‘ جواء‘ شراب نوشی اور قتل جیسا کوئی بھی جُرم کرسکتا ہے‘ زبردستوں کے سامنے دُم ہلاتا ہے اور کمزوروں پر بھونکتا ہے۔ کسی کو بدمعاش کہنا اُسے گالی دینا ہے۔ آپ بدمعاش کو بھی بدمعاش نہیں کہہ سکتے کہ آپ اس کی بدمعاشی کا شکار بن سکتے ہیں۔

لیکن آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ شخص بدمعاش نہیں ہے۔ زیرِ نظر تحریر ختم ہونے پر آپ جان جائیں گے کہ حقیقت میں بدمعاش کون ہے۔

’’بد‘‘ فارسی زُبان کا لفظ ہے اردو میں بُرائی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بدکار‘ بدذات‘ بدکردار‘ بدنیّت‘ بدنام‘ بدتمیز وغیرہ۔

’’معاش‘‘ عربی زبان کا لفظ ہے۔ عیش عربی لُغت میں گندم کی روٹی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اردو میں بھی ہم معاش کو روٹی روزی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ذریعہ معاش یعنی روزی کمانے کا ذریعہ۔ روزگار‘ معاشی حالات‘ قومی معیشت۔ معاشیات وہ مضمون ہے جو سامانِ زیست کا احاطہ کرتا ہے۔

پس بدمعاش وہ شخص ہوا جس کا معاش کا ذریعہ ’’بد‘‘ ہے۔ اب اپنے اردگرد گلی بازار سے لے کر‘ ملکی اور بین الاقوامی سطح تک دیکھئے وہ کون لوگ ہیں جن کی حصولِ رزق کی بُنیاد بُرائی پر ہے۔ ایسے افراد کی پہچان بہت آسان ہے۔ ان کی چار نشانیاں ہیں:

☆ جو خود کوئی کام نہ کرے اور دوسروں کی محنت کے حاصل کا مالک بن جائے۔

☆ جو اپنی محنت‘ خدمت یا پیداوار کا کئی گُنا معاوضہ وصول کرے۔

☆ متعدد جرائم کو پیشہ بنا کر معاوضہ وصول کرے۔

☆ جو سرمائے کا معاوضہ وصول کرے۔

اس بدمعاشی کے مخصوص نام ہیں مثلاً رشوت خور‘

سُود خور، ذخیرہ اندوز، ناجائز منافع خور، ملاوٹ کرنے والے جعلساز، دونمبریئے، سمگلر، منشیات کے ہر سطح کے کاروباری، پیر فقیر، جاگیردار، زمین دار اور کارخانہ دار جو کرایہ دار، کسان اور مزدور کا استحصال کرتے ہیں۔ پاکستان کے ۹۰ فی صد (یقیناً) افسران، حکمران، ممبران قومی وصوبائی اور اب ضلعی اسمبلیوں کے ناظم اور اُن سے بھی نیچے سٹی، ٹاؤن اور یونین کونسلوں کے ممبران جو اربوں روپے تنخواہ، الاؤنسز، دیگر مراعات، فنڈز ناجائز ہڑپ کرتے ہیں۔ وہ سب افراد جنہوں نے شعبۂ تعلیم اور صحت کو نفع بخش کاروبار بنالیا ہے۔ یہ لوگ سینکڑوں یا ہزاروں میں نہیں ان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ پٹواری سے چیف سیکرٹری محکمہ مال تک اور آئی جی سیکریٹریٹ سے لیکر کانسٹیبل تک۔ عرضی نویس سے سپریم کورٹ تک۔ یہی وسعت اور پھیلاؤ باقی مذکورہ بالا بدمعاشوں کا بھی ہے۔

پولیس کا سپاہی جس روز نوکری کی درخواست لکھتا ہے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنخواہ میں سادہ روٹی بھی نہیں کھا سکے گا۔ وہ دانستہ اوپر کی کمائی کے لئے اپنی مرضی سے یہ ادنیٰ نوکری بھاری رشوت اور سفارش سے حاصل کرتا ہے۔

ظلم کی انتہا ہے کہ ایک گروہ ان بدمعاشوں کو عزت مآب قرار دیتا ہے۔ پنڈت ہو یا پادری، مولوی ہو یا مفتی ان بدمعاشوں سے نذرانے قبول کر کے انہیں جنت کی بشارت دے دیتا ہے۔ صدقات، خیرات اور زکوٰۃ دے کر یہ بدمعاش اللہ کے گھر میں بھی تاخیر سے آ کر نمازیوں کو پھلانگتے ہوئے پہلی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ شریعت اور طریقت کا گٹھ جوڑ ان کی ناجائز کمائی کو اللہ کا فضل اور پیر و مرشد کی دُعاؤں کا اثر قرار دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ میں خود اپنی کتاب کا محافظ ہوں۔ تاقیامت کوئی بھی اس میں ایک لفظ تک تبدیل نہیں کرسکتا۔ اسلئے نام نہاد پیر فقیر قرآن کے الفاظ تو نہ بدل سکے لیکن ان کا مفہوم تبدیل کر دیا۔ بدمعاش کے معانی اشرافیہ میں تبدیل ہوگئے۔

اس لئے آج کا مذہب اسلام، دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ والا دینِ اسلام نہ رہا۔

بغیر محنت کئے دوسروں کی کمائی پر زندہ رہنے والی مذہبی پیشوائیت خود معاشِ بد کا ایک مجسم نشان ہے۔

نقطۂ نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی

موقر ماہنامہ 'محدث' کی خدمتِ عالیہ میں

کمترین راقم سطور کے مضمون کے جواب میں پروفیسر (مولوی) محمد دین قاسمی صاحب کا ایک علمی اور سنجیدہ مقالہ ''محدث'' بابت اگست ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔ میں پروفیسر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے مضمون کو درخور اعتنا سمجھا اور اس پر تبصرہ تحریر فرمایا۔

مجھے اپنی اس خامی کے اعتراف کرنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی کہ میں بنیادی طور پر طبعاً مناظر واقع نہیں ہوا ہوں۔ میری طبیعت مناظرے سے اِبا کرتی ہے۔ مناظرہ حق و باطل کا معیار نہیں ہوتا۔ یہ محض Mental Gymnastic ہوتا ہے اور اس سے مناظر کی انا (Ego) کو تسکین ہوتی ہے کہ میں نے مقابل کو ہرا دیا ہے۔ اس لئے اس مضمون میں پیش نظر مناظرہ ہے نہ خدانخواستہ اپنے بزرگ بھائی پروفیسر (مولوی) محمد دین قاسمی صاحب کو شکست دینے کا خیال۔ مقصد صرف احقاق حق اور ابطال باطل ہے جس کا طریقہ بھی پیش خدمت عالی کر دیا گیا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ پروفیسر صاحب عالم ہیں۔ ان کے مضامین سے یہ بات عیاں ہے۔ نظریات کا اختلاف اور ان کو کھل کے تحریر کرنا، علمی اعتبار سے ایک بڑی خوش آئند بات ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ پاکستان میں ابھی اس درجہ رواداری کا ماحول پیدا نہیں ہو سکا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر یورپین ممالک، جنہیں ہم ہر وقت برا کہتے ہیں، ان میں اسی طرح کی رواداری برتی جاتی ہے اور یقیناً پروفیسر صاحب بھی اس سے واقف ہوں گے اور آپس میں عناد کیسا؟ ہم سب قرآن کے خادم و عاشق ہیں، مسلمانوں کے زوال و ادبار پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی ترقی و خوشحالی کے خواہاں ہیں۔ سب پاکستانی ہیں۔ صرف نظریات کے اختلاف سے کیسی دشمنی اور کیسی مغائرت؟ ہم سب ایک ہیں اور امتِ واحدہ ہیں۔

راقم سطور بصد معذرت اپنے سابقہ مضامین کے دو اقتباسات تحریر کر رہا ہے۔ انہیں ملاحظہ فرمائیں۔ چونکہ ان کو پیش نظر لانے سے کوئی مفر نہیں، اس لئے مجبوراً ان کو تحریر کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔

''حدیث شریف کے سلسلہ میں اصل نقطۂ ماسکہ اس

کی اہمیت وعظمت، اس کی شرعی و آئینی حیثیت، اس کی حفاظت اور صحت وسقم نہیں ہے بلکہ اصل مبحث اس کا وحی الٰہی قرار دینا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً علماء کرام و فقہائے عظام احادیث پر برابر مضامین تحریر کرتے چلے آرہے ہیں اور کتابوں پر کتابیں شائع ہوتی چلی جارہی ہیں۔لیکن کوئی صاحب تصنیف عالم تھوڑی دیر رک کر یہ نہیں سوچتا کہ اصل مبحث ہے کیا اور اس کا جواب کیا ہے؟ متذکرہ صدر موقر جریدہ میں بھی اس مسئلہ کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا اور صرف ایک مقام پر حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب مدظلہ نے اس کا تذکرہ صفحہ ۲۱۸ پر فرمایا کہ: ''یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کی طرح سنت وحدیث بھی منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو'' مولانا روم کا شعر بھی تحریر فرمایا:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

جبکہ حضرت اقدس نے سنت نبوی کو حکمت اور وحی خفی قرار دیا ہے۔(صفحہ ۲۱۹) حکمت کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے۔اس معاملہ میں بھی حضرت سے تسامح ہوا ہے۔اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علماء کرام اس نقطہ نگاہ سے واقف نہیں ہیں بلکہ حدیث کی ساری بحث میں یہ موضوع ایسا ہے کہ علماء کرام خوب واقف ہیں کہ ان کا یہ موقف نہایت کمزور اور انتہائی ضعیف ہے اور کسی طریقہ سے بھی احادیث جو عرصہ کے بعد جمع و مدون کی گئیں وحی ثابت نہیں کی جاسکتیں اور وحی ثابت نہ ہونے کی صورت میں حدیث شریف کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔یہی وجہ ہے کہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل رسالہ میں حدیث پر جامع مضامین تحریر کئے گئے' عربوں کے حافظے کو سراہا گیا' جو بالکل غیر متعلقہ عنوان ہے' مگر اس مسئلہ کو صرف ایک جگہ بیان کیا گیا ہے۔حالانکہ ساری بحث کا مرکز ومحور یہی ایک نقطہ ہے اور امت مسلمہ کو جس قدر نقصان اس غلط نظریہ سے ہوا اور کسی نظریہ سے نہیں ہوا۔جبکہ حقیقتاً حدیث شریف کے وحی الٰہی نہ ہونے سے علماء کرام کی تیار کردہ ساری عمارت خاک کے تودہ کی طرح زمین بوس ہو جاتی ہے''۔ (مقتبس از ''ماہنامہ محدث کے شمارہ انکار حدیث پر تبصرہ'' ۔طبع شدہ ''طلوع اسلام۔اپریل ۲۰۰۳ء)

دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''وحی خفی کا عقیدہ ہمارے علمائے کرام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔صدر اول میں اس عقیدہ کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔تقریباً دوسو سال کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا۔ ہمارے علمائے کرام' پاکستان میں جس جس

طبقۂ فکر کو استحقاراً واستخفافاً ''منکرین حدیث'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں وحی خفی کا انکار ان سب میں مشترک ہے۔ اس طبقہ کا بیشتر حصہ حدیث کا منکر نہیں ہے۔ بلکہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو' اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیتا ہے انکار حدیث کا الزام ان کے ذمہ غلط ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ حدیث کو وحی تسلیم کرنے پر کسی طرح بھی آمادہ نظر نہیں آتے۔ ہمارے علماء کرام نے ان نام نہاد ''منکرین حدیث'' کے خلاف تقریباً تین سو سے زیادہ کتب تصنیف فرمائی ہیں اور تقریباً ہر فرقہ نے ہی تصنیف کی ہیں۔ جن میں نام نہاد 'منکرین حدیث' کے ایک ایک نظریہ کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے۔ حدیث کی حمایت میں بہت تفصیل سے صحاح ستہ کے مصنفین کے حالات رقم کئے ہیں۔ عربوں کے حافظوں کی بڑی تعریف کی کہ ان کے حافظے اس قدر مضبوط تھے کہ انہوں نے احادیث کو نقل کرنے میں بہت کم غلطیاں کی ہیں۔ اسماء الرجال کے متعلق بہت مواد مہیا کیا۔ لیکن اصل موضوع جو سب (نام نہاد) 'منکرین حدیث' کا اصل الاصول اور عروۃ الوثقیٰ ہے کہ حدیث وحی نہیں ہے اور 'وحی صرف قرآن میں ہے' اس موضوع پر کچھ تحریر کرنے سے ہمارے علماء کرام ہمیشہ بچتے رہے اور اجتناب کرتے رہے ہیں' کمترین راقم سطور نے اس موضوع پر ۶ مفصل مضامین تحریر کئے جو عرصہ دراز پیشتر 'طلوع اسلام' میں طبع ہوئے تھے' پھر گزشتہ دو سال قبل 'محدث' کے 'انکار حدیث نمبر' پر تبصرہ رسالہ ہذا میں طبع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بھی راقم سطور نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمارے علماء کرام حدیث کو وحی ثابت کرنے کے لئے مضمون تحریر کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ لیکن تاحال کسی رسالہ یا کتاب یا ''محدث'' میں ایسا مضمون تحریر نہیں کیا گیا جس میں حدیث کو وحی خفی ثابت کیا گیا ہو' اس مضمون میں پھر اسی درخواست کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام حدیث کے وحی ہونے پر کوئی ایسا جامع ومبسوط مضمون تحریر فرمائیں تاکہ نام نہاد 'منکرین حدیث' کو اپنے موقف پر دوبارہ غور کرنے کا موقع فراہم ہو''۔

(طلوع اسلام' مئی ۲۰۰۵ء' صفحہ ۲۹' ۳۰)۔

دونوں اقتباسات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ آپ نے خود ملاحظہ کیا کہ ان دونوں مضامین میں راقم سطور نے اس بات پر کس درجہ اصرار کیا ہے کہ حدیث شریف کو وحی ثابت کرنے کے لئے علماء کرام مضمون تحریر فرمائیں۔ لیکن اس تمام عرصہ میں ایک مضمون بھی اس موضوع پر کہیں نہیں آیا۔ یہ دونوں اقتباسات یقیناً پروفیسر صاحب کی نگاہ سے گذرے

ہوں گے۔ پروفیسر صاحب کا موجودہ مضمون ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے میرے ایک ایک نظریہ اور خیال کی تردید بہت محنت سے فرمائی ہے۔ خصوصاً نسخ اور اطاعت رسول کے موضوع پر طویل بحث ہے۔ لیکن یہ دونوں عنوانات تو میرے مضمون کے موضوع ہی نہیں تھے۔ ان دونوں عنوانات پر طلوع اسلام میں الگ الگ بارہا مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اصل موضوع روایات کو وحی ثابت کرنا ہے جس کے لئے محترم پروفیسر صاحب نے صرف دو پیرا گراف چوبیس سطروں پر مشتمل تحریر فرمائے ہیں، ان میں بھی حضرت نے اپنی طرف سے ایک سطر کا بھی اضافہ نہیں کیا صرف حوالہ جات تحریر فرمائے ہیں۔

''وحی صرف قرآن میں ہے'' کوئی نیا موضوع نہیں ہے سابقہ دور میں معتزلہ اور امام ابوداؤد ظاہری کا فرقہ ظاہر یہ اس نظریہ کے قائل تھے۔ موجودہ دور میں اس نظریہ پر سب سے پہلے مولوی محمد عبداللہ صاحب نے تحریری مواد فراہم کیا۔ ان کی تفسیر بنام ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان ۱۹۰۶ء میں اسلامیہ حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور سے طبع ہوئی۔ علماء اہل قرآن میں سے مشہور عالم، خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری کی تفسیر ''بیان للناس'' ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی۔ ان ہی اہل قرآن حضرات کی جماعت امت مسلمہ اہل الذکر والقرآن، ۱۹۲۶ء میں امرتسر میں قائم ہوئی۔ ڈاکٹر برکت علی قریشی پی۔ایچ۔ڈی۔ اس کے صدر اور مشہور و معروف علمی شخصیت پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ میاں مولا بخش، حکیم شہاب الدین اور علامہ حکیم محمد حسین عرشی مرحوم نے مل کر مشہور رسالہ ''بلاغ'' ۱۹۲۴ء سے امرتسر میں جاری کیا۔

ادھر لاہور میں 'اشاعت القرآن' نام کا رسالہ مولوی حشمت علی صاحب ایڈٹ کرتے رہے۔ حکیم فیروز الدین لغرائی کے شدید اصرار پر مولوی ثناء اللہ صاحب اور خواجہ احمد الدین امرتسری صاحب کے مابین قلمی مباحثہ ہوا جس کا موضوع 'وحی صرف قرآن میں ہے' تھا۔ اس مباحثہ کی شرائط میں طے ہوا تھا کہ دونوں حضرات کی طرف سے چار چار پرچے ارسال ہوں گے، اور ان کے اندر اندر موضوع کا فیصلہ کرنا ہے۔ مگر افسوس کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے صرف دو پرچے ارسال فرمائے اور اس کے بعد پرچہ ارسال کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کی کیا وجوہات ہوں گی، یہ راقم سطور کو معلوم نہیں کیونکہ یہ واقعہ راقم سطور اور اس کے بھائی محمد دین قاسمی صاحب کی پیدائش سے پیشتر کا ہے۔

یہاں اس نظریہ کی تاریخ Trace کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف مختصر طور پر یہ تحریر کرنا مناسب سمجھا گیا ہے کہ یہ نظریہ کوئی دو چار سال کا نہیں ہے، بلکہ تقریباً ایک سو سال سے یہ نظریہ فروغ پا رہا ہے۔ اگرچہ اس نقطۂ نظر کے خلاف چاروں

طرف سے یلغار ہے اور کوئی باقاعدہ جماعت یا تحریک اس کی ترویج میں حصہ نہیں لے رہی ہے' لیکن یہ نظریہ اپنی صداقت و حقانیت کی وجہ سے اپنے Momentum (حرکتِ درونی) کے زور پر خود بخود اشاعت پذیر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کی موافقت میں ہزاروں ہزار مضامین تحریر کئے جا چکے ہیں' تفاسیر تحریر کی جا چکی ہیں' لیکن اس کا جواب دینے میں علماء اہل روایات کی طرف سے ہمیشہ گریز کیا جاتا رہا ہے۔ ایک سو سال کے عرصہ پر محیط لٹریچر کے جواب میں' میرے بزرگ دوست جناب پروفیسر قاسمی صاحب نے ایک تو جناب مولانا مودودی صاحب اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے قلمی مباحثہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس وقت وہ رسالہ میرے پاس موجود نہیں ہے' عرصہ ہوا پڑھا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس مباحثہ کا موضوع 'سنت کی آئینی حیثیت' تھا۔ اس سارے مباحثہ میں ایک لفظ بھی 'حدیث وحی ہے' کے موضوع پر نہیں تھا۔ جہاں تک جناب قاسمی صاحب نے انکارِ حدیث نمبر میں 'اس موضوع پر شائع ہونے والے ۷۰۰ کے لگ بھگ مقالات کی فہرست کے متعلق تحریر فرمایا ہے تو نہایت حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ ان ۷۰۰ مقالات میں ایک مقالہ بھی 'حدیث وحی ہے' کے موضوع پر نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ قاسمی صاحب جیسے لوگ کیسے اس درجہ علمی بددیانتی کا ارتکاب کر دیتے ہیں اور کس طرح قارئین کو مغالطہ دیتے ہیں۔ وہ فہرست طبع شدہ ہے ہر شخص وہ پڑھ کے اس علمی بددیانتی Intellectual Dishonesty کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اس فہرست میں وہی مضامین۔ 'انکارِ حدیث'۔ 'مرکزِ ملت'۔ 'قرآن و اطاعت رسول'۔ 'حفاظتِ حدیث کا اہتمام'۔ 'علم اصولِ حدیث اور اس کا ارتقاء'۔ 'نقدِ حدیث کے لئے روایت کے اصول'۔ 'منکرین حدیث کے جمعہ کا جواب'۔ 'منکرین حدیث کے اوچھے حملے'۔ وغیرہ عنوانات پر مضامین میں بہت بلند و پراثر نام ہیں۔

اسماء سمیتموھا انتم و آبائو کم ما انزل اللہ بھا من سلطان (۲۳/۵۳)۔

الفاظ بلند اور معانی میں ہو پستی
فائز اسے اردوئے معلّٰی نہیں کہتے

یہ تمام مضامین نہایت محنت و خلوص سے تحریر کردہ ہیں۔ لیکن پھر وہی افسوس کی بات ہے کہ اصل موضوع ان ۷۰۰ مضامین میں کسی ایک مضمون میں بھی زیرِ بحث نہیں آیا۔ آپ اسے کیا کہیں گے کہ یہ اتفاق کی بات ہے یا عمداً گریز ہے؟

البتہ جہاں تک مبارک پوری صاحب کے مضمون کا تعلق ہے' یہ میری کمزوری ہے کہ وہ میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ یقیناً یہ رسالہ میرے لئے نہایت گرانقدر ہے۔ کمترین اس کو محدث کے دفتر سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

راقم سطور پورے تیس سال ایسے محکمہ سے منسلک رہا جس میں علمائے کرام کی ریل پیل تھی۔ علمائے کرام کی دل بھر

کے خدمت کی اور دل بھر کے ان سے محبت کی۔ کیونکہ میری بھی ساری عمر دینی مدارس کے ساتھ ہی گزری ہے اور شیخ الکل فی الکل، امام القراء، قاری اظہار احمد صاحب تھانوی سے تلمذ کی سعادت رہی۔ مولانا عبدالقادر آزاد، مولانا روپڑی، مولانا عرفانی وغیرھم سے برادرانہ مراسم رہے۔ چونکہ ان بزرگوں سے قرآنی نظریات کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی تھی اس لئے ان بزرگوں نے سخت اصرار کیا کہ میں قرآنی نظریہ کے متعلق ایک مضمون تحریر کروں۔ ان کے اصرار شدید پر میں نے 'وحی صرف قرآن میں ہے' کا پہلا حصہ تحریر کیا جو بعد میں طبع بھی کیا گیا۔ اس کا طبع کرنا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا کیونکہ بڑا بڑا چغادری مولوی پھنکارے مارتا ہوا آیا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اور میرے مزید مضامین کی طباعت کیوجہ سے ان کے پھنکاروں میں تو اضافہ ہوتا رہا لیکن حرام ہے کہ ان میں سے کسی صاحب نے ان مضامین کی تردید میں کوئی ایک سطر بھی تحریر کی ہو۔ میری بار بار کی تحدی کے باوجود انہوں نے ایک سطر بھی تحریر نہیں کی۔ ذاتی نوعیت کی یہ چند سطور تحریر کرنے کے لئے سخت معذرت خواہ ہوں لیکن یہ ذاتی نوعیت کی چند سطور اپنی طبع کے خلاف مجبوراً صرف اس وجہ سے تحریر کی گئی ہیں کہ راقم سطور کو اپنی کم علمی کا خوب خوب اندازہ ہے، لیکن علمائے کرام کا اس موضوع (وحی خفی) سے گریز مجھے اپنے موقف کی صداقت پر مزید مستحکم کر دیتا ہے۔ فللہ الحمد۔

میں نے اپنے بھائی قاسمی صاحب کے مضمون سے عمداً اعتناء نہیں کیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ خدانخواستہ یہ علمی مضمون نہیں ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اگر مضمون کی دیگر معنویات سے تعرض کیا گیا تو حضرت ان کے جوابات تحریر کرنے میں ہی الجھے رہیں گے۔ حد درجہ کوشش یہ ہے کہ صرف اس مضمون (وحی خفی) کو مرکز گفتگو بنایا جائے اور بس۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو راقم سطور تو اپنے نقطہ نگاہ کو چند الفاظ میں پیش کر دیتا ہے کہ جن احادیث کو خارج از قرآن وحی کہا جاتا ہے تو یہ احادیث حضور ﷺ کی احادیث ہیں ہی نہیں بلکہ ذخیرۂ روایات ہیں۔ کیونکہ ڈھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلٍ ایک زبان سے دوسری، دوسری سے تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی زبان تک منتقل ہوتے آ رہے ہوں ان کا اپنی اصل شکل میں موجود رہنا بالکل ناممکن ہے اور ہمارے علمائے کرام بھی روایت بالمعنی کے قائل ہیں، اسی وجہ سے 'روایت شریف' کے آخر میں اوکما قال علیہ السلام تحریر کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ روایات تو احادیث رسول ہیں ہی نہیں۔ روایت شریف کے یہ الفاظ تو خود رواۃ کے الفاظ ہیں جو ان کے منہ سے نکلے ہیں۔ رواۃ کرام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کسی طرح وحی الٰہی ہو سکتے ہیں؟ ہمارا دیرینہ مطالبہ جناب کے حضور یہ ہے کہ آپ رواۃ کے منہ سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو وحی ثابت کریں۔

میں اپنی تمام تر عاجزی، تواضع، انکساری اور فروتنی کے باوجود اپنے بزرگ بھائی جناب پروفیسر (مولوی) محمد دین صاحب قاسمی اور ان کی معرفت تمام علمائے اسلام کو تحدی (Challange) کرتا ہوں، کہ وہ اس موضوع پر کوئی جامع ومبسوط مضمون تحریر فرمائیں۔وان لم تفعلوا ولن تفعلوا (۲/۲۴)۔

آخر میں میں پروفیسر قاسمی صاحب کو اپنا بھائی سمجھ کر یہ درخواست کروں گا کہ انہوں نے جو (۱) خدا پرستی کا مسلک چھوڑنے والا (۲) ہوا پرست (۳) خود غرض (۴) پرکار (۵) ضدی اور ہٹ دھرم کے الفاظ میرے متعلق تحریر فرمائے ہیں بہتر ہوگا کہ آئندہ ان سے اجتناب فرمائیں۔ کیونکہ مسلمان کا کیا کام کہ کسی دوسرے کا دل دکھائے۔

وھٰھنا منا تم الکلام۔ علی مُصطفٰناً الوف سلام

محمدِؐ عربی کہ آبروئے ہر دوسرا است
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بلاتبصرہ

وفاقی وزیرتعلیم کی توجہ کے لئے

امتحانی نظام میں نت نئی تبدیلیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بوریوالہ کے جناب خالد جاوید لکھتے ہیں:

۲۰۰۲ء میں جب نہم اور دہم کلاسز کے الگ الگ امتحانات لینے کا فیصلہ کیا گیا تو اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک کسی بھی طالب علم کو فیل نہیں کیا جائے گا۔ ہر مضمون کے تحریری یا زبانی ماہانہ ٹیسٹ لئے جائیں گے اور ان ٹیسٹ کا ریکارڈ رکھا جائے گا۔ اساتذہ کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ کم نمبر حاصل کرنے والے کمزور طلباء کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے۔ حتیٰ کہ ایسے طلباء کے والدین کو بھی ان کے نتائج سے آگاہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ بات بھی حوصلہ شکنی کے زمرے میں ہی شمار کی جاتی ہے۔ طلباء کو جسمانی سزا بالکل نہ دی جائے اور کسی طالب علم کو بھی خواہ وہ سکول میں حاضر ہو یا نہ ہو خارج نہ کیا جائے۔ اساتذہ غیر حاضر طلباء اور ان کے والدین سے رابطہ کر کے ان کی حاضری کو ہر حال میں یقینی بنائیں۔

۲۰۰۳ء میں تمام تعلیمی بورڈز نے جماعت نہم کے امتحانات نئی سکیم کے تحت لئے اور حسب وعدہ کسی بھی طالب علم کو فیل نہ کیا گیا۔ بلکہ ان کی گریڈنگ کر کے تمام طلباء کو جماعت دہم میں ترقی دے دی گئی۔ ۲۰۰۴ء میں انہی طلباء کا جماعت دہم کا امتحان بھی انہی خطوط پر لیا گیا اور کسی طالب علم کو بورڈ کی طرف سے فیل نہ کیا گیا بلکہ ان طلباء کو جو رزلٹ کارڈ جاری کئے گئے ان پر بھی نوفیل پالیسی کے مطابق گریڈنگ کی گئی تھی۔ لیکن جب ان طلباء نے گیارہویں جماعت یا دوسرے ڈپلومہ جات وغیرہ میں داخلہ لینے کے لئے کالجز کا رخ کیا تو اہالیان کالج نے ایسے طلباء کو داخلہ دینے سے صاف انکار کر دیا جن کے رزلٹ کارڈز پر ایک یا ایک سے زیادہ مضامین میں گریڈ "F" درج تھا۔ کیونکہ ان کے معیار کے مطابق ایسے تمام طلباء فیل تھے۔ اب ذرا آپ ان طلباء اور ان کے والدین کی پریشانی کا اندازہ لگائیں جو اپنے آپ کو بورڈ کی یقین دہانیوں کے مطابق پاس تصور کر رہے ہیں اور داخلہ دینے والے کالجز کے نزدیک وہ فیل ہیں۔ اس طرح ۲۰۰۴ء میں میٹرک پاس کرنے والے طلباء کی کثیر تعداد اس دو رخی پالیسی کا شکار ہو کر مزید تعلیم کے لئے اگلی کلاسز میں داخلہ حاصل کرنے میں ہی کامیاب نہ ہو سکی

اور مجبوراً انہیں حصول تعلیم کے سلسلہ کو خیر باد کہنا پڑا۔

۲۰۰۴ء میں جماعت نہم کے طلباء نے بھی تعلیمی بورڈز کا امتحان اسی پالیسی (نو فیل پالیسی) کی بنیاد پر دیا تھا اور تعلیمی بورڈز نے ان تمام طلباء کو حسب پالیسی پاس کر دیا اور وہ جماعت دہم میں داخل کر لئے گئے اور انہی طلباء نے جماعت دہم کا امتحان بھی اسی پالیسی کے تحت ۲۰۰۵ء میں دیا۔ لیکن جب نتائج کا اعلان کیا گیا تو تعلیمی بورڈز نے اپنی ہی دی ہوئی پالیسی سے انحراف کرتے ہوئے طلباء کو فیل اور پاس کی بنیاد پر رزلٹ کارڈ جاری کئے۔ گویا کہ کہا یہ گیا تھا کہ کسی طالب علم کو فیل نہیں کیا جائے گا اور عملاً طلباء کی بہت بڑی اکثریت کو فیل کر دیا گیا۔ اب والدین اور طلباء پھر پریشان حال مارے مارے پھر رہے ہیں کہ کیا کریں؟ کدھر جائیں کس سے فریاد کریں؟ امتحانی پالیسی میں تبدیلیاں اس تیزی سے ہو رہی ہیں کہ محکمہ تعلیم سے متعلقہ افراد خود بھی اکثر ان سے لاعلم ہوتے ہیں۔ چہ جائے کہ وہ دوسروں کی راہنمائی کریں۔

آپ ذرا ایک ایسے طالب علم کو احاطہ تصور میں لائیں جو جماعت نہم کا امتحان دیتا ہے اور تمام مضامین میں صفر صفر نمبر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعت کے لئے بورڈز کے امتحانات میں باقاعدگی سے شرکت کرتا ہے اور ہر امتحان کے تمام مضامین میں صفر صفر نمبر حاصل کرتا ہے لیکن مذکورہ امتحانی پالیسی کے تحت وہ پاس تصور کیا جائے گا۔

جب ایک اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے عام آدمی کے نزدیک بھی یہ امتحانی پالیسی ناقابل عمل تھی تو اس کے خالق کی ذہنی استعداد کیا ہوگی۔ اس نے جن لوگوں سے صلاح مشورہ کیا ہوگا وہ ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے کس سطح پر ہوں گے۔ کیا واقعی ان کا آئی کیو لیول اوسط درجے سے بھی کم تر ہے اور اگر یہ سچ ہے تو یہ لوگ کس چیز کے زور پر ملک و قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والی سیٹوں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور اگر یہ سچ نہیں ہے اور یہ پالیسی ساز افراد یقیناً بہت ذہین اور فطین ہیں تو ان کی یہ ذہانت کس مقصد کے حصول کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

خالد جاوید/ ڈپٹی ہیڈ ماسٹر

گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول بوریوالہ، ضلع وہاڑی۔

روزنامہ جنگ 17/9/2005

☆☆☆

جماعت اسلامی اور معاشرہ

''اصل میں مولانا مودودی نے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی حوالے سے اسلام کی جو تعبیرات پیش کی تھیں وہ محض رومانوی اور غیر حقیقت پسندانہ تھیں اور وقت نے ان کا غلط ہونا ۵۰ ہی سال میں واضح کر دیا ہے۔ معاشرتی حوالے سے مولانا کی تین کتابیں اہم ہیں۔ ''پردہ''۔ ''اسلام اور ضبط ولادت'' اور ''حقوق الزوجین'' آج ان تینوں کتابوں میں ظاہر کردہ نظریات کو عملاً جماعت اسلامی بھی ترک کرتی جا رہی ہے''۔

(ارشاد احمد حقانی۔ جنگ 10/8/2005)

اسلامی قوانین خدا نے نہیں بنائے وہ تبدیل ہو سکتے ہیں۔

اسلام آباد (آن لائن) اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود نے کہا ہے کہ اسلامی قانون اور فقہ قرآن میں نہیں۔ اسی طرح اسلامی (فقہی) قوانین خدا کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور انہیں بار بار تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے گزشتہ روز ایس۔ڈی۔پی۔آئی کے زیر اہتمام کتاب اور روایت کے درمیان اسلامی قانون کی تشکیل کے موضوع پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی روایات کوئی جامد چیز نہیں یہ ہمیشہ متحرک اور پھلتی پھولتی رہتی ہے مگر ان روایات کو مسلمانوں میں عدم تحفظ کے احساس کے سبب خول چڑھا کر جامد کر دیا گیا' ان خولوں کو توڑنا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابتدائی اسلام میں شعائر پرستی نہیں تھی لوگ سوالات اٹھاتے اور ان کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی۔ ہر کوئی بحث میں حصہ لیتا مگر بعد میں چند اسکالر اسلام میں پہلی دفع شعائر پستی لائے۔ انہوں نے قرآن پاک کو سنت رسول کی روشنی میں سمجھنے پر زور دیا اور کہا کہ اسلامی قانون میں استخراجی روایت پر طاری جمود کی ایک اور وجہ اسلامی دنیا بالعموم اور جنوبی ایشیا بالخصوص مغربی ممالک کے زیر تسلط تھا جس سے مسلم امہ میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا اور اسلامی روایات بچانے کی کوشش میں انہوں نے اس پر نئی سوچ کے دروازے بند کر دیئے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی قانون اور فقہ قرآن میں نہیں' قرآن میں صرف اشارے ہیں جن سے انسان اسلامی قوانین اخذ کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی قوانین خدا کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور انہیں بار بار تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ امریکن انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز کے پروجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر نعمان الحق نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی روایات کو اس قدر سخت کر دیا گیا ہے کہ کتاب (قرآنِ کریم) کو فراموش کر دیا گیا۔ کتاب کو روایت کے خول میں بند کر دیا گیا ہے اسلام میں تنقیدی سوچ کا فقدان ہے۔

(روزنامہ امت' کراچی' بابت ۲۸ ستمبر ۲۰۰۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وزیر محمد جعفر کامونکی
Email:wazeer254@hotmail.com

حضرت پیر بابا بش صاحب کے الہامات اور امت مسلمہ

گزشتہ کئی دنوں سے بین الاقوامی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں امریکی صدر بش کے الہامات پر مشتمل خبر پر تبصرے ہو رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں برطانوی نشریاتی ادارہ بی بی سی لندن ایک دستاویزی فلم تین اقساط میں نشر کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اس ادارہ نے 10 اور 17 اکتوبر 2005 کو پہلی اور دوسری قسط نشر کی ہے۔ جبکہ تیسری اور آخری قسط 24 اکتوبر 2005ء کو نشر کرے گا۔ اس دستاویزی فلم کے مطابق صدر بش نے اپنے الہام کی بات 2003ء میں فلسطینی رہنما محمود عباس اور وزیر نبیل شاط سے ملاقات کے دوران کہی تھی، نبیل شاط کے مطابق بش نے کہا کہ انہیں خدا نے یہ مشن سونپا ہے' خدا نے کہا جارج جاؤ اور افغانستان میں دہشت گردوں سے جنگ کرو' لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر خدا نے کہا جارج جاؤ اور عراق میں بدی کا خاتمہ کرو' چنانچہ میں نے یہی کیا' اب ایک بار پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجھے الہام ہو رہا ہے۔ خدا کا کہنا ہے کہ فلسطینی ریاست قائم کرو' اسرائیلیوں کو سیکیورٹی فراہم کرو اور مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرو' خدا کی قسم میں ایسا ہی کروں گا۔ محمود عباس نے بش کے الفاظ یاد کئے بش نے کہا کہ یہ میرا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے اس لئے میں آپ کیلئے فلسطینی ریاست قائم کر کے رہوں گا۔ اگرچہ وہائٹ ہاؤس کے ترجمان نے الہام کی خبر کی تردید کی ہے۔

جب میں نے یہ دستاویزی فلم دیکھی تو مجھے پی ٹی وی پر پچھلے ماہ نشر ہونے والا قسط وار ڈرامہ یاد آ گیا۔ اس ڈرامے کا نام آدھی دھوپ تھا۔ اس ڈرامہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک پیر صاحب تھے جن کا نام پیر قلندر شاہ تھا۔ جو اپنی ہر بات اپنے مریدوں کو یہ کہہ کر سناتے کہ مجھے مرشد پاک نے یہ الہام کیا ہے کہ فلاں کام کرو۔ قلندر کو پیر قلندر شاہ مشہور کرنے والا ایک شاطر دماغ بابا پھیکا تھا جو اس کا حصہ دار تھا۔ گاؤں میں جو بھی پیر قلندر شاہ کی مخالفت کرتا پیر قلندر اسے اپنے ساتھیوں سے اتنا پٹواتا کہ وہ بیچارہ پاگل ہو جاتا۔ آخر میں پیر قلندر شاہ کا شاطر دماغ بابے پھیکے سے حصہ داری کے معاملہ میں پھڈا پڑ جاتا ہے۔ شاطر دماغ بابا پھیکا بغاوت کر دیتا ہے اور وہ گاؤں والوں کو حقیقت بتا دیتا ہے کہ پیر قلندر شاہ کو کسی قسم کا

کوئی الہام نہیں ہوتا۔ اپنی طرف سے باتیں بناتا ہے۔ یہ سارا ڈرامہ ہے۔ پیر قلندر شاہ آخر کار خودکشی کر لیتا ہے۔

اس ڈرامہ کی طرح بش کو پیر بنانے میں برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کا ہاتھ ہے کیونکہ ٹونی بلیئر بش کے ہر کام میں حصہ دار ہے۔ بش جس کو چاہتا ہے ٹونی بلیئر کے ساتھ مل کر تباہ و برباد کر دیتا ہے جیسا کہ افغانستان اور عراق میں کیا ہے۔ اسی لئے چند ایک ممالک کو چھوڑ کر باقی سب نے صدر بش کو اپنا پیر و مرشد مان لیا ہے۔ ہمارے حکمران تو ہر سہ ماہی پر ان کی قدم بوسی کیلئے دربار پر حاضری دینا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ خود نہ جا سکیں تو کوئی وفد بھیج دیتے ہیں۔ تاکہ دربار سے تعلق قائم رہے۔ ہم پہلے سنتے تھے کہ ملک کے وزرائے اعظم اپنے اپنے دور حکومت میں حضرت بابا تنکے شاہ جی کے پاس جاتے رہے تاکہ اقتدار کو طول دے سکیں تو حضرت بابا تنکے شاہ جی ان کو چھڑی سے پیٹتا کہ جا بیٹا تیری حکومت قائم رہے گی۔ لیکن ان کی حکومت نہ بچ سکی کیونکہ کام اچھے نہیں کئے تھے۔ اس لئے انکو حکومت سے باہر کر دیا گیا۔ بلکہ جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا۔ اب تو ہمارے حکمرانوں کو بابے تنکے شاہ پر اعتبار نہیں رہا اس لئے انہوں نے پیر کامل حضرت بابا بش صاحب کا انتخاب کیا ہے۔ کبھی کبھار انڈیا بھی چلے جاتے ہیں اور اجمیر شریف والی سرکار کے دربار پر حاضری دے آتے ہیں یہ اس لئے کہ اگر پیر کامل حضرت بابا بش صاحب کبھی ناراض ہو گئے اور ملک سے بھاگنا پڑے تو اجمیر شریف میں سیاسی پناہ مل سکے۔ ہمارے ایک وزیر اعظم کو مدینے جانے کا بہت شوق تھا اسی لئے انہیں دس سال کے لئے حجازِ مقدس بھیج دیا گیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ مستقبل میں ہمارے موجودہ حکمرانوں کے ساتھ زمانہ کیا سلوک کرتا ہے۔

قارئین! آیئے میں آپ کو بتاؤں کہ الہام کیا ہوتا ہے؟ اور یہ عقیدہ اسلام میں کس طرح رائج ہوا؟ اس عقیدہ نے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچایا؟

ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ پیغمبروں پر وحی کا نزول ہوتا ہے اور اولیاء و صوفیاء پر الہام ہوتا ہے۔ یعنی وہ اللہ سے ہم کلام ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کو الہام نہیں کہتے اسے ''وحی'' کہتے ہیں اور وحی کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی ذات پر ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ سے براہِ راست کوئی علم حاصل کرنے کا دعویٰ کرے تو یہ ختم نبوت کی مہر توڑنا ہوا یا نبوت کا دعویٰ ہے۔ چاہے اس بات چیت کو وہ کوئی سا بھی نام دے۔ یہی وہ چور دروازہ ہے جس سے نبوت کے جھوٹے دعویدار پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔

اس کی ضرورت کیسے پڑ گئی؟ بات یہ ہے کہ مشقت سے روزی کمانا بڑا مشکل کام ہے بلکہ شیوۂ پیغمبری ہے۔ بھلا کون کسی کو مجبور کر سکتا ہے کہ دوسرا کما کر لائے اور وہ بیٹھ

کر کھائے۔ یہ تب تک ممکن نہیں جب تک آدمی خود کو دوسروں سے بالاتر (ممتاز) نہ مشہور کر دے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور بات چیت کا دعویٰ کیا جائے۔ بات ختم۔ کھانا پینا مفت، احترام الگ، لوگ مرید بننے لگے۔ دھتکارو گالیاں، دو سوٹیاں مارو، لوگ قدم چومیں گے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائیے کیا یہی کچھ نہیں ہو رہا، کبھی کسی پیر، مرشد یا صوفی کو مزدوری کرتے کماتے دیکھا ہے؟

تاریخ اٹھا کر دیکھئے پشتون لیڈر بایزید انصاری (پیرِ روشان) کو مغلوں سے آزادی کے لئے لشکر کی ضرورت پڑی تو اس نے الہام اور رب سے ندا کا سہارا لیا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑے لشکر کا مالک بن گیا۔ مغل شہنشاہ نے اس کے مقابلے کے لئے اخون درویزا کو بھیجا، اس کے ہاتھ میں بھی یہی تصوف کا ہتھیار تھمایا۔ مطلب یہ کہ کسی کو تابع کرنا یا اس سے کام لینے کے لئے یہ کہنا بڑا مفید اور آسان ثابت ہوا ہے کہ مجھے غیب سے احکام ملتے ہیں، مجھے اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کرنے والے کے خلاف اللہ کا فرمان ہے:

''اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔ اور جو یہ کہے کہ جس طرح کی کتاب اللہ نے نازل کی ہے اس طرح کی میں بھی بنا لیتا ہوں اور کاش تم ان ظالم (یعنی مشرک) لوگوں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں (مبتلا) ہوں اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لئے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں، آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور اس کی آیتوں سے سرکشی کرتے تھے''۔ (سورۃ الانعام۔ آیت نمبر 94)۔

ایسے سخت احکام کے باعث کس میں ہمت تھی کہ وہ وحی کا دعویٰ کرتا۔ لہٰذا ایسے کرنے والوں نے جدید تکنیک استعمال کی۔ اللہ تعالیٰ سے بات چیت کا نام وحی کی بجائے الہام رکھ دیا اور یہ مشہور کر دیا کہ پیغمبروں پر وحی کا نزول ہوتا ہے اور ولی، صوفی پر الہام کا، وہ معجزے دکھاتا ہے تو یہ کرامت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے کہ حکومت روزنامہ بندگی کو بند کر دے تو وہی پرچہ روزنامہ زندگی کے نام سے شائع ہونے لگے۔ اس طرح حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونکا جاتا ہے۔ یہ حضرات اللہ کے ساتھ وہی کچھ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ زہر کو تریاق کا نام دیا جائے تو کیا وہ تریاق کا کام دے گا؟ سانپ کو اگر رسی کا نام دیا جائے تو کیا وہ ڈسنا چھوڑ دے گا؟

غضب یہ ہوا کہ یہ بھی مشہور کر دیا کہ وحی دو قسم کی ہوتی ہے ایک وحی جلی دوسری خفی۔ جلی کی تعلیم تو حضورﷺ دیا کرتے تھے۔ خفی کو الہام کا نام دیا گیا۔ بہرحال یہ حضرات کسی

چیز کے محتاج نہیں ہوتے۔ابن عربی اپنی کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں کہ جس مقام سے ایک نبی لیتا ہے' وہیں سے انسان کامل' صاحبِ زمان' غوث وقطب لیتے ہیں اور نبی تو محتاج ہیں جبرائیلؑ کے'ہم براہِ راست(ڈائریکٹ) جاکر کام کرا لیتے ہیں۔یعنی ان کے ہاں اللہ کا دربار نہ ہوا کسی پاکستانی آفیسر کا آفس ہوا کہ کچھ لوگ تو ایک دستخط کے لئے لائن لگائے گھنٹوں سے کھڑے اپنی باری کا انتظار کررہے ہیں۔اور کچھ ایسے بھی ہیں جو بغیر انتظار کی زحمت اٹھائے بغیر اجازت اندر جا کر دستخط کرا کر چلے جاتے ہیں۔یہ اس لئے کہ ابن عربی نے کہا ہے کہ ''مقام الولی فوق الانبیاء ودون اللہ'' یعنی ولی کا مقام انبیاء سے اوپر اور اللہ سے نیچے ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ خاتم الانبیاء کے مقابلے میں ایک ولی زیادہ افضل اور پاورفل سمجھا جانے لگا۔

اسی لئے مرزا غلام احمد قادیانی نے الہام کا سہارا لے کر نبوت کا دعویٰ کردیا۔دلیل کے طور پر فصوص الحکم اور وضعی احادیث کا سہارا لیا۔

قارئین! آپ نے دیکھا کہ الہام کا عقیدہ کس قدر خطرناک ہے۔اس عقیدہ نے امت مسلمہ کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں ان تمام باطل عقائد سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے جن کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔کسی بھی ایسے شخص کی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے جو الہام کا دعویٰ کرتا ہو۔امت مسلمہ کے حکمرانوں کو صدر بش کے الہام پر یقین نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنی عوام کو ان تمام علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کریں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔تاکہ امت مسلمہ میں صحیح معنوں میں قائدانہ صلاحیتیں پیدا ہوں۔صدر بش کو اس بات کا الہام نہ ہوا کہ قطرینہ اور ریٹا آرہے ہیں۔پھونک مار کر ان کو روک لیتا لیکن ان طوفانوں کی رفتار ہی اتنی تیز تھی کہ الہام نہ ہوسکا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

مسئلہ جنات

(گذشتہ سے پیوستہ)

مع الحدیث

انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو ان کی منفرد معاشرتی طرزِ حیات اور مختلف افتادِ طبع کی وجہ سے خدا نے انہیں ایک بلیغ استعارے میں جن قرار دیا۔ ''جن'' کے عمومی قرآنی معانی تو یہی ہیں۔ اگر کہیں سانپ یا بیکٹیریا[1] وغیرہ کو بھی ''جن'' کہا گیا ہے تو وہ جنات کی دوسری قسم ہیں جو بارِ شریعت کے مکلّف ہیں نہ کسی سماجی ضابطے کی اتباع کے پابند۔ اللہ کے وہ مخاطب ہیں نہ اللہ کے رسول کا تخاطب ان کی جانب ہے کہ جن مخلوقات پر ''سزا جزا'' کا اصول ہی لاگو نہیں ہوتا' بھلے وہ کائنات کا حصہ ہوں' خدا کی تخلیق ہوں مگر ''بے اختیار'' ہونے کے سبب وہ دائرہ انسانیت سے باہر جا پڑتے ہیں' یوں اس بحث سے خارج ہو جاتے ہیں جو اس سمے ہمارے پیشِ نظر ہے۔

البتہ اس مقام پر جن کی صفت ناریت کی مزید توضیح ناگزیر ہے۔ فرمایا گیا:

و خلق الجآن من مارج نار۔

اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا۔

---

1. اس مقام پر ایک نکتہ معاً ذہن میں پیدا ہوا ہے کہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مرتبہ فرمایا گیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال وطیب چیزیں کھاؤ پیو۔ ظاہر ہے جب قرآن جن وانس کے لئے یکساں Authority ہے تو یہ ارشاد دونوں گروہوں پر یکساں نافذ العمل ہوگا۔ جو بھی طیبات ہیں وہ یقیناً جنات اور انسانوں کے لئے ایک ایسی ہی ہوں گی۔۔ لیکن ترمذی کی مشہور حدیث ہے ''ہڈی گوبر وغیرہ جنوں کی غذا ہے اس لئے ان سے استنجا نہیں کرنا چاہئے۔'' سوال یہ ہے کہ انسان تو ہڈیوں اور گوبر کو کسی طرح اپنے لئے لطیف وطیب خوراک خیال نہیں کرتے' پھر حضورﷺ کے اس فرمان کے کیا معنے ہوئے کہ یہ جنات کی غذا ہیں؟ اگر منا ہی ہو تو دونوں کے لئے ہو' اجازت اِباحت ہو تو فریقین کے لئے ہو۔ لیکن آپ دیکھئے کھانا تو درکنار انہیں طہارت کے لئے استعمال کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

اب وہ مخلوق جو ڈی کمپوز ہونے والے گوبر' لید اور ہڈیوں وغیرہ کو بطور ''غذا'' استعمال کرتی ہے۔ بیالوجسٹ اسے Bacteria & Fungi کہتے ہیں اور اس کی کوئی اٹھائیس ہزار اقسام شمار کرواتے ہیں۔ اسے ''حسن اتفاق'' ہی کہئے کہ مذکورہ مخلوق عام آنکھوں سے تو بہر حال دکھائی نہیں دیتی۔ یہ کم بخت اس قدر مختصر الجثہ ہے کہ زیارت کے لئے باقاعدہ مائیکروسکوپ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر اس مستور مخلوق کو جن/ جنات سے موسوم کر لیا جائے تو غالباً مضائقے والی کوئی بات نہیں۔ اس طرح آپﷺ کی نصیحت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بیماریوں کے ان گنت جراثیم کی بلاواسطہ زد میں پڑی ہوئی ہڈیوں' لید اور گوبر وغیرہ سے اگر صفائی کی غرض سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی تو انسان کو سو قسم کے عوارض لاحق ہونے کا بہر نوع امکان ہے۔

(۱۵/۵۵)۔

والجآن خلقنه من قبل من نار مسموم۔

اور ہم نے جنات کواس سے پہلے تیز آگ سے پیدا کیا ہے۔(۱۵/۲۷)۔

اب اگران آیات کوظاہر پرمحمول کیا جائے اور جملہ جنات کوان کا مصداق قرار دیا جائے تو منظر کچھ یوں ترتیب پائے گا کہ چتا جل رہی ہوگی اوراس میں سے جن تیار ہو ہوکر نکل رہے ہوں گے۔اگرتواب بھی جنات موجود ہیں تو یقیناً وہ اسی فارمولے کے مطابق پیدا ہوتے ہوں گے۔کیا کسی نے کبھی آگ میں سے جنات جنم لیتے ہوئے دیکھے ہیں؟ درآں حالیکہ گھر گھر میں آگ صبح وشام جلتی ہے۔کیا ایسا وقوعہ کسی کی آنکھوں نے دیکھا ہے کہ کھانا پکانے کے لئے چولہا جلایا ہؤ چند ثانیوں بعد اس شعلے سے ایک 'نومولود' جن برآمد ہو گیا ہو؟

حل اس مسئلے کا یہ ہے کہ ان آیات کو دو احوال پر منطبق کیا جائے۔

(۱) انسانوں سے پہلے اس کرۂ ارض پر ایک مخلوق کوتسلیم کیا جائے جس کی بابت خود قرآن نے مذکورہ آیات کی صورت میں شہادت دی جن کا قرآنی مفہوم یہ ہے۔

''اور انسانوں سے پہلے اس زمین پر ایسی مخلوق تھی جس میں حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی کیونکہ زمین کی جو حالت اس زمانے میں تھی' اس میں اس قسم کی مخلوق زندہ رہ سکتی تھی۔وہ مخلوق اب ناپید ہو چکی ہے اوراس کی جگہ انسانوں نے لے لی ہے۔''(۱۵/۵۵)۔

''واضح رہے کہ انسانی تخلیق سے پہلے کرۂ ارض میں بے پناہ حرارت تھی۔اس لئے ابتداً یہاں ایسی مخلوق کی نمود ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ وہ مخلوق اب باقی نہیں رہی۔ انسان اسی کا جانشین ہے''۔(۱۵/۲۷)۔

(۲) اس قدیم اور گرم مخلوق کی آتش مزاجی اور شعلہ صفتی کوانسانوں کے ان گروہوں پر منطبق کیا جائے جنہیں قرآن میں جنات کہا گیا ہے۔وہ جنات جوتمدنی ادوار کی یادگار ہیں۔ جو انبیاء کے مخاطب رہے ہیں۔

☆☆☆

دیکھئے قرآن مجید میں حقیقتاً کوئی ''ماضی''۔ ماضی نہیں ہے۔ یہ قرآن کی حکمت کا اعجاز ہے کہ وہ ہر ماضی کا حال پر انطباق کرتا ہے۔کیونکہ قرآن کوئی ہسٹری کی کتاب تو ہے نہیں۔ قدیم سے قدیم واقعے اور قصے کی کوئی نہ کوئی Relevance-cy لمحۂ موجود کے ساتھ لازماً بنتی ہے اور قرآن کے لمحۂ موجود کا ایک سرا نزولِ قرآن کے عہد سے بندھا ہوا ہے تو دوسرا سرا یوم قیامت سے منسلک ہے۔اس کے بیچ کا کل زمانہ وہ Nowness ہے جس میں قرآن ہمیشہ

رہے گا اور بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو 'کُن' کی صدا Applied کا مخاطب آج کا انسان بھی ہے کہ دیکھو اے انسان! اپنی آنکھوں سے' سنو اے انسان! اپنے کانوں سے' محسوس کرو اے انسان! اپنے دل سے کہ 'کُن' کے جواب میں 'فیکون' کا Response پیہم آ رہا ہے۔ یہ کائنات اپنے استکمال کی اور برابر بڑھ رہی ہے۔

جس خوش بخت کے سمع و بصر و فواد اس مکالمے پر شاہد بن جاتے ہیں وہ تخلیقی عمل کا گواہ بن کر 'مقرب الٰہی' قرار پا جاتا ہے۔ اس کی ذات نشو و نما کے عمل سے سرفراز کر دی جاتی ہے اس کے قدم تسخیرِ فطرت کے ارادے سے اٹھنے لگتے ہیں۔ اس مجاہد کے من آنگن میں قوانین قدرت کے انکشافات اور اکتشافات کی پھوار مسلسل برسنے لگتی ہے۔

اس تناظر میں غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اس قدیم آتشیں مخلوق کا مجمل سا ذکر کر کے معاملے کو چھوڑ نہیں دیا بلکہ اسے ایک تسلسل بخشا ہے کہ اس کی نسبت سے انسانوں کے ایک گروہ کو مستقل تعارف دے دیا ہے اور جسے اس ''اسم'' کا علم مل گیا یوں جانئے اس نے خود کو 'آدم' کا موزوں جانشین ثابت کر دیا۔

آدم سے یاد آیا کہ اس کے متعلق بھی تو کہا گیا ہے خلقنه من طین کہ ہم نے اسے مٹی سے پیدا کیا ہے اور ایک جگہ فرمایا ہے خلقنه من صلصال من حماء مسنون۔ یعنی آدم کو آواز دینے والی مٹی ایسے سیاہ گارے سے پیدا کیا ہے۔ اب ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھیں اگر ہمارے سوال کے جواب میں کوئی کہے: 'جن تو عام حالات میں نظر نہیں آتے' پیدا ہوتے ہوئے کیا دکھائی دیں گے؟' تو ہم عرض کرتے ہیں کہ آدمی تو آپ دن رات دیکھتے ہی رہتے ہیں اور ماشاء اللہ دن رات پیدا بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی متبدل ہیئت کے سیاہ گارے یا مٹی کیچڑ سے کسی انسان کو انگڑائی لیتے ہوئے دیکھا ہے جو یہ کہہ رہا ہو' دیکھو دیکھو! میں پیدا ہو رہا ہوں۔

سب جانتے ہیں پیدا ہونے کا Process ہی اور ہے۔ ہاں اگر عمومی اعتقاد کے مطابق یہ نکتہ پیش کیا جائے کہ صرف پہلا انسان (آدم) ہی مٹی سے بنایا گیا تھا باقی انسان نہیں۔ تو صاحب! پھر صاف ظاہر ہے کہ پہلے انسان کی طرح پہلا جن ہی آگ سے بنایا گیا ہوگا' باقی جنات نہیں۔ کیونکہ جیسے اب انسان مٹی سے نہیں بنتے' ویسے ہی اب جنات بھی آگ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں یہ بھی صراحت فرمائی جائے کہ جنات کا موجودہ طریق پیدائش کیا ہے؟ اگر وہ بھی جننیوں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں تو توالد و تناسل کے متداول فطری طریق کے مطابق پیدا ہونے والے جنات بہرحال آگ سے نہیں بنائے گئے' یعنی پہلے جن کے علاوہ باقی جنات آگ سے خلق نہیں ہوئے۔ چنانچہ پھر موجودہ جنات کو

آتشیں مخلوق کہنا اسی طرح بے جا ہے جیسے موجودہ انسان کو مٹی اور گارے کی مخلوق قرار دینا صحیح نہیں۔۔!!!

غالباً ہم ابتدا میں کہیں 'تخلیق آدمؑ' کے حوالے سے گفتگو کر آئے ہیں جس کا ماحصل یہی ہے آدم (آدمی) کی شروعات چونکہ مٹی سے ہوئی اس بنا پر اسے تراب کی عترت یعنی مٹی کی مخلوق کہا گیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ زمین پر زندگی کا نقطہ آغاز چونکہ مٹی بنی لہٰذا موجودہ آدمی کی ابتدائی نسبت مٹی سے قائم ہوتی ہے۔ یقیناً کچھ ایسا ہی معاملہ ناپید ہو جانے والی آگ کی مخلوق (جنات) سے ہوا ہوگا کہ اس زندگی کا اولین نقطہ آگ بنی ہوگی۔ (ویسے یہ حقیقت ثابتہ بھی ہے) اب زمین پر زندگی کے آغاز سے لے کر اس آدم تک جسے اللہ نے ہدایت کی ذمہ داری بخشی تدریج کی متعدد کڑیوں کے بغیر 'قصے' کو 'جوڑنا' پڑتا ہے۔ کیا عجب آئندہ ذہن انسانی اتنی ترقی کر جائے کہ وہ ارتقاء میں سے غائب کڑیوں (Missing Links) کو دریافت کر لے۔ ظاہر ہے یہ Assignment سائنس کے علماء سے ہی متعلق ہے' کسی مذہبی مدرسے کا مولوی' کسی خانقاہ کا گدی نشین یا کسی معمل کا عامل تو اس Thesis پر کام کرنے سے رہا۔

ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ عنقا ہو جانے والی گرم مخلوق (جنات) کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور اس کے انجام تک کل کتنے پڑاؤ آئے؟ یہ وہ اسرار ہیں جن کی بابت حتم و یقین سے سردست کوئی کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اب اگر اس Mystery کو کوئی Exploit کرنا چاہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اعجاز دیکھیں کہ وہ Verbalism پر Symbolism کو کیسے ترجیح دیتا ہے۔ جنات کی ''ناریت'' اور آدم کی ''ترابیت'' سے وہ ایک نئی اور منفرد Dimension ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ جی ہاں آگ کی خصوصیات اور مٹی کی خصائص کو اس رنگ میں نمایاں کرتا ہے کہ انہیں دونوں گروہوں یعنی جن وانس پر باری باری اور بار بار منطبق کرتا ہے۔ اس زاویے سے نگاہ دیکھنے کی جب خوگر ہو جاتی ہے تو ذہن پر نئی معنویتوں کا نزول ہونے لگتا ہے' شعور کے آفاق پھیلنے لگتے ہیں' فکر کی آنکھوں کے عدسوں میں آئینہ در آئینہ کا Scenario تر و تازہ ہو جاتا ہے اس طرح قصہ آدم محض ماضی کا حصہ نہیں رہتا حال کی گھڑی کا واقعہ بن جاتا ہے' ایسا ''حال'' جس میں ماضی و مستقبل کی ندیاں مستقلاً رواں ہیں۔

اس علامتی نظام سے معانی کی جدید جہت پھریوں اخذ ہوتی ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو اس کی فطرتی مطاوعت' شفقت' نرمی اور ملائمت کی وجہ سے انسان نام دیا گیا ہے اور دوسرے گروہ (جنات) کو اس کی مزاجی درشتی' سختی' دماغ داری' شعلہ نفسی اور آتش سرشتی کی وجہ سے جن سے موسوم

کیا گیا ہے۔

اب بات قدرے اور نکھر کر سامنے آ گئی ہے کہ بھلے زندگی کا نقطہ آغاز مٹی ہونے کی نسبت سے انسان کو مٹی کی اولاد یا مٹی کا پتلا کہا جائے لیکن Simultaneously اس کے ترابی ہونے کے یہ معنی بہرنوع بنیں گے کہ انسان کی سرشت' طبیعت' سیرت' طینت اور عادت میں ملائمت' عطوفت اطاعت وانقیاد کا جذبہ' تسلیم ورضا اور فرمانبرداری کی خُو رکھ دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح کمہار نرم مٹی سے مختلف ظروف تشکیل دیتا ہے' اسی طرح انسان بھی گیلی مٹی کی طرح عمدہ اور اعلیٰ اخلاق کے سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔ اس کریم النفس اور کثیر النوال انسان کا ذہنی ڈھانچہ اس انداز میں مرتب ہوا ہے کہ یہ نیکی کو قبول کرنے اور راستی کو جذب کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتا ہے اور اپنے سے بہتر خوبیوں کے مالک شخص کا مطیع وتابع فرماں بن سکتا ہے۔ جب کہ جنات کی جبلت' خصلت' خلقت' غریزت اور فطرت میں یہ بات ''رکھ'' دی گئی ہے کہ وہ نافرمانی' سرکشی' غصہ' قہر' غضب اور آتش مزاجی کا اظہار کریں گے۔ مراد یہ کہ جن کے نار سے خلق ہونے کے مجازی معنے یہ بھی ترتیب پائیں گے۔

عربی لغت سے واقفیت رکھنے والے بتاتے ہیں کہ خلق من فلاں سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی گھٹی' سبھاؤ اور فطرت میں یہ خصوصیت رکھ دی گئی ہے۔

اس ضمن میں قرآن نے حضرت انسان کی ''خلقت'' سے کچھ پردے اٹھا کر اس کی ''اصلیت'' ظاہر کی ہے۔ مثلاً

۱۔خلق الانسان من عجل۔

ہم نے انسان کو جلدی سے پیدا کیا ہے۔ (۲۱/۳۷)۔

۲۔اللہ الذی خلقکم من ضعف۔

یعنی انسان کو اللہ نے ضعف سے پیدا کیا ہے۔ (۳۰/۵۴)۔

۳۔و خلق الانسان ضعیفا۔

اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

۴۔ان الانسان خلق ھلوعا۔

انسان کی خلقت میں بے صبری ہے۔ (۷۰/۲۰)۔

ان سب فرمودات کو نظر میں رکھتے ہوئے البتہ اس فرمان سے صرفِ نظر بھی نہیں کرنا چاہئے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔

اب اسے حق پہنچتا ہے' پورا حق' جس نے یہ سوالات اٹھائے ہیں:۔

۱۔ کیا تعجیل (جلدی) کسی مادے مواد کا نام ہے؟

۲۔ ضعف کس Substance کا اسم گرامی ہے؟

۳۔ بے صبری کس Matter کو کہتے ہیں؟

ہم نے ان سوالات کے جوابات تلاش کرتے ہوئے جو پڑھا سمجھا اس کی تلخیص ہماری سوچ کے مطابق یہی سامنے آئی:

انسان کی سرشت میں یہ بات ''رکھ'' دی گئی ہے کہ وہ ہر کام کا نتیجہ معجّل طلب کرنے کا شدید خواہشمند رہتا ہے اور اس کی زبان ہر آن یہی تلاوت کرتی رہتی ہے۔

الانتظار اشد من الموت

کام کرنے میں' Step اٹھانے میں بھی عجلت اور شتابی سے کام لیتا ہے اور صلہ وثمر حاصل کرنے کی آرزو میں بھی بے تابی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انسان کے زود اثر ہونے کی بنا پر کہا گیا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ضعف سے پیدا ہوا ہے یعنی طبعاً کمزور ہے۔اور واقعتاً یہ حضرت انسان کا طبعی ضعف اور ذہنی ناتوانی کا ہی اظہار ہے کہ درخت' آگ' پانی' پہاڑ' سانپ' چاند' سورج ستارہ۔۔ حتیٰ کہ اپنے جیسے انسانوں کے آگے جھک گیا۔

بے صبری بھی ضعف ہی کا شاخسانہ ہے۔ ماننا پڑے گا کہ اس کی فطرت میں تلون اور جبلت میں بے صبری ہے تو سہی۔ ذرا اذیت پہنچتی ہے بلبلا اٹھتا ہے۔ فائدہ پہنچ جائے تو بخیل بن جاتا ہے۔

☆☆☆

اچھا اس عاقبت نااندیش اور بے تاب تمناؤں کے مالک انسان کے مذکورہ Characteristics بھی شمار کروا دیئے اور ساتھ ہی یہ اعزاز بھی دے دیا کہ موصوف بہترین ساخت' پر پیدا ہوئے ہیں۔

فطری طور پر سوالات تو یہاں بھی ایک دم سر ابھارتے ہیں جو تعداد میں ایک سے زائد ہیں۔۔سب سے پہلے ہم نسبتاً مشکل سوال کو لیتے ہیں۔توقع ہے اس کے جواب میں ہی باقی سوالات کے جوابات بھی آ جائیں گے۔

جب 'جن' بھی لازماً انسان ہی ہیں تو وہ بھی یقیناً بہترین ساخت اور سلیم فطرت پر پیدا ہوئے ہوں گے' پھر ان کی خو میں آتش مزاجی اور ناری صفات کا مطلب کیا ہوا؟

فی الاصل ہم نے اوپر فطرت' سرشت' جبلت' غریزت' گھٹی' سبھاؤ' خصلت' اور خلقت وغیرہ الفاظ کو عمداً 'مترادفات' کے طور پر استعمال کیا تھا تاکہ سوال اپنے صحیح خدوخال میں سامنے آ سکے۔ جو صورت گری کے عمل میں سے گزر کر سامنے آ گیا اور پھر اسی سے یہ سوال تشکیل پایا ہے کہ

آیا انسان کی کوئی فطرت ہے؟

اس موضوع پر ہمارے مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ:

انسانی فطرت سے مراد کسی بھی انسان میں موجود 'امکان' ہے۔بس جسے 'امکان' کا درک حاصل ہو گیا وہ اس پیچیدہ مسئلے کو سمجھ گیا۔

اہل علم نے جبلت اور فطرت میں بجا طور پر خطِ امتیاز کھینچا ہے۔ حیوانوں کے لئے انہوں نے جبلت کی Term مخصوص کی ہے اور اس جبلت (Instinct) کی تعریف یوں وضع کی گئی ہے کہ جملہ بہائم اپنی جبلتوں کے اسیر ہیں۔ان کی پیدائش سے موت تک کا جو Cycle قدرت نے مقرر کر دیا ہے وہ اس سے سرِمو انحراف کرنے کی طاقت بلکہ ارادہ واختیار ہی نہیں رکھتے چنانچہ وہ کسی سزا جزا کے پابند نہیں ہیں۔اس کے برعکس انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مشیت کے تحت صاحبِ ارادہ واختیار تخلیق کیا ہے لہٰذا وہ اپنے اعمال و افعال کے حوالے سے جوابدہ ہے۔اب سوال یہ ہے کہ جب اس کی کوئی فطرت ہی متعین نہیں تو پھر یہ کہنا کہ ہم نے اس کی خلقت میں عجلت پسندی' ضعف اور بے صبری رکھ دی ہے۔ جب انسان ان ''خوبیوں'' کا اسیر ہے' ان سے باہر جا ہی نہیں سکتا' پھر اس سے حساب کتاب کیوں؟ اور ان عطا فرمودہ رویوں پر اسے مطعون کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کا محاسبہ کس بنیاد پر کیا جاتا ہے؟

یہاں سے بحث کا رخ مسئلہ تقدیر کی طرف مڑ رہا ہے' سو تفصیلات سے دامن بچاتے ہوئے ہم صرف یہی گزارش کریں گے کہ قدرت نے انسان کے اندر مذکورہ رویے/ رجحانات/ خصائص/ اوصاف بصورتِ امکان رکھے ہیں۔ اب انسان ان کا قیدی ہو کر نہیں رہ گیا کہ وہ اپنی ہمت سے کبھی ان سے جدا ہی نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے نہ صرف ہوسکتا ہے بلکہ اسے حکم ہے کہ ان سے علیحدہ ہونے کی کامیابی حاصل کرو۔

مثلاً جہاں یہ کہا گیا ہے ''ہم نے انسان کو جلدی سے پیدا کیا ہے''۔ وہاں اگلے الفاظ یہ ہیں سـاوریـکـم ایٰتی فلا تستعجلون۔ سو میں تم کو اپنی آیات دکھاؤں گا' لہٰذا تم جلد بازی سے کام نہ لو۔

''یہ سب اس لئے کہ انسان دور تک نگاہ نہیں لے جاتا' بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔ چونکہ ان کے اس انکار و سرکشی کی وجہ سے ان پر فوری گرفت نہیں ہوتی اس لئے یہ تیری تنذیرات کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ یوں جلدی مت مچاؤ۔ وہ دن دور نہیں جب خدا کی نشانیاں حقیقت بن کر تمہارے سامنے آجائیں گی اور تم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے''۔ (۲۱/۳۸)۔

''اسی اصول میں قوموں کے عروج و زوال کا راز بھی پنہاں ہے۔ قوموں کی حالت دراصل افراد کی سی ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل واضح ہے۔ تم جب پیدا ہوتے ہو تو تمہاری حالت بڑی کمزور ہوتی ہے۔ پھر اگر تمہاری پرورش قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو وہ کمزوری قوت میں بدلتی جاتی ہے۔ پھر اس قوت کے بعد تم پر کمزوری اور بڑھاپا چھا جاتا ہے۔۔۔''۔ (۳۰/۵۵)۔

''بے صبری کا یہ عالم کہ ذرا سی تکلیف پہنچے تو واویلا

مچانا شروع کر دیتا ہے تنگ دل ایسا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ''ہے نہیں۔ ہے نہیں'' کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔'' (۷۰/۲۰)۔

غور فرمایئے کہ انسان کو عجلت پسند کہا ہے تو تاکید بھی کی ہے' میاں! جلدی نہ مچایا کرو۔ ضعیف کہا ہے' ساتھ ہی یہ نوید بھی دے دی ہے کہ قانونِ خداوندی کی پیروی کرو گے تو توانا ہو جاؤ گے۔ بلکہ اگلی آیت میں اور وضاحت کر دی ہے کہ تمہاری قومی زندگی بھی اسی کی مثال ہے کہ قوت حاصل کرنے کے بعد غافل ہو جاؤ گے تو ضعف وانحطاط آ جائے گا۔ مطلب یہ کہ ارتقا و ترقی کے عمل سے تساہل نہیں برتنا۔ اسی طرح جہاں بے صبری کا ''طعنہ'' دیا ہے وہاں بھی تھوڑا آگے چل کر فرما دیا ہے کہ جو لوگ مصلی (یعنی نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے والے ہیں) وہ بے صبری اور نیتوں کے بھوکے پن کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

گویا بات کچھ یوں سمٹی کہ انسان چونکہ مختار ہے اس لئے وہ ان کمزوریوں پر قابو بھی پا سکتا ہے اور اپنی مرضی سے اپنے اندر ان کمزوریوں کی افزائش پر بھی اسے قدرت حاصل ہے۔ یعنی ضعف' طاقت' بے صبری' صبر' جلد بازی' تحمل۔۔ منفی مثبت کے یکساں امکانات اس کے اندر موجود ہیں۔

اور فی نفس الامر کیا یہودی اور کیا عیسائی' کیا ہندو اور کیا سکھ' کیا مجوسی اور کیا مسلمان سبھی 'نیک فطرت' پر جنم لیتے ہیں۔ یعنی ان نشاف ناعم نومولودوں میں خیر' نیکی' سلم' حق' سچائی' صدق اور راستی کو جذب کرنے کی بھی فطری صلاحیت ودیعت کی گئی ہوتی ہے۔ ہر بچہ غلط تربیت کی وجہ سے نفرت' شر' دہشت گردی' باطل اور فساد کی طرف بھی مائل ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی یہی ہے کہ اس معصوم کے دنیا میں آتے ہی اختیار و ارادہ فعال ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں اس کا ذاتی اکتساب' تصرف' خواہشات' بیرونی حالات' اندازِ تربیت اور خارجی عوامل اس کی ذات پر اثر پذیر ہو کر اسے عموماً اس راہ پر لے کے چل پڑتے ہیں جس جادے پر اس کے اجداد' اس کا ماحول اور اس کی سوسائٹی پہلے سے گامزن ہوتے ہیں۔ ایک بچہ مشرقی روایات اور ثقافت واقدار کے امین گھرانے میں جنم لے اور اس کی تمام تر پرورش اور تربیت مغربی معاشرے میں ہو' یقیناً وہ وہاں کے اسلوبِ حیات' تہذیبی' تمدنی' سیاسی' تعلیمی اور لسانی روایتوں کا بھرپور علم بردار بن کر منظر پر ابھرے گا۔ فی الحقیقت فطرت کا یہ مضمون بے حد اہم ہے۔ اس کی توضیح قرآن مجید کے اس مقام پر بھی موجود ہے۔

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ۔

''صحیح روش زندگی یہ ہے کہ تو ان تمام غلط راہوں سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہات کو اس نظامِ زندگی پر مرکوز کر دے جو خدا کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے۔ اور

جس قانون کے مطابق اس نے خود انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہ خدا کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے اور جس قانون کے مطابق اس نے خود انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کا یہ قانونِ تخلیق غیر متبدل ہے..........'' (۳۰/۳۰)۔

قرآن کی اس آیت کی ضیا میں یہی بات سمجھ آتی ہے کہ انسان مشیت ایزدی اور قانونِ الٰہی کے مطابق پیدا ہوا ہے۔یعنی نیک فطرت پر پیدا ہوا ہے کہ خدا کا قانون اور مشیت' نیکی' خیر اور سلم پر مبنی ہے کون نہیں جانتا کہ انسانی قلب و ذہن وقت پیدائش صاف و شفاف تختی کی مانند ہوتے ہیں۔ جو چاہے لکھ لو۔ پیغامِ خیر یا درس شر۔ قبولِ خیر و شر کی یہ یکساں صلاحیت ہی درحقیقت 'فطرت سلیمی' یا 'نیک فطرت' ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حق انسان زندگی میں ایک ہی بار استعمال نہیں کر سکتا۔ مرتے دم تک جب چاہے اور جتنی بار چاہے خیر کو قبول کرلے' شر کو رد کر دے یا اس کے برعکس شر کو قبول کرلے اور خیر کو رد کر دے۔

اگر صرف ایک پہلو کو قبول و جذب کرنے کی اہلیت ہوتی تو اسے ''فطرتِ سلیمہ'' تو قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اس سے اس کا مجبورِ محض ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اسے صاحبِ تصرف و ارادہ پیدا کیا ہے یعنی اس میں خیر کو قبول کرنے کی بھی اتنی ہی قدرت اور مکنت رکھی ہے جتنی استعداد شر کو قبول کرنے کے حوالے سے رکھی گئی ہے۔ درحقیقت یہی یکساں صفت اور صلاحیت ''فطرتِ سلیمیٰ'' کہلائی جانے کی صحیح مستحق ہے۔لہٰذا انسان کے متعلق ان ہر دو نظریات:

ا۔ اس کی کوئی فطرت نہیں

۲۔ فطرت سلیمیٰ پر پیدا ہوا ہے

میں کوئی تعارض نہیں بلکہ اتم ترادف و تماثل ہے۔ البتہ اگر ضمناً یہ اعتراض وارد کیا جائے کہ فطرت ہوتی ہی غیر متبدل ہے۔ مثلاً جانور کی جو جبلت ہے تمام عمر وہی رہے گی۔ اس میں تغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس معاملہ میں مجبور و بے تصرف ہے۔ اس کے برعکس انسان چونکہ اپنی کیفیاتِ ذہنی' قوتِ ارادہ کے زور پر عمر کے کسی بھی حصہ میں تبدیل کرنے پر قادر ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تصرف و ارادہ کا اختیار کامل جو مستقل حیثیت رکھتا ہے' بجائے خود ایک 'فطرت' ہے کیونکہ اس کے مجاز و مختار ہونے کی مستقل حیثیت سے ہمیں انکار نہیں اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مستقل حیثیت ہی فطرت کہلاتی ہے۔ چنانچہ ہمہ وقت زاویۂ فکر کو تبدیل کرنے کی مستقل طاقت و استعداد انسان کی غیر متبدل 'فطرت' ہے۔

اب واضح ہو گیا ہو گا کہ انسان کے ''بہترین ساخت'' پر پیدا ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ ہاں جناب! انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے' یہ پیدائشی آزادی ہی اس کی

''بہترین ساخت'' ہے۔[1] اب وہ چاہے ضعیف بنے یا قویٰ جلد باز بنے یا بردبار' بے صبرا بنے یا صابر۔ اس میں مساوی امکانات موجود ہیں۔

اور کھلے امکانات کی یہی بہار انسانوں کے دوسرے گروہ یعنی جنات کو بھی عطا ہوئی ہے۔ بھلے دونوں کا تشخص جدا جدا ہو مگر عطا ہونے والے اختیارات کی تقسیم At Par ہے' بالکل مساوی۔ کسی سے کوئی ناانصافی نہیں کی گئی۔ لہٰذا اوپر جو یہ عرض کیا گیا ہے کہ جنات کی سرشت میں آتش مزاجی کا عنصر ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسانوں کا یہ گروہ (جنات) اپنی سرشت کا اسیر ہے اور اس سے باہر نکلنے پر قدرت ہی نہیں رکھتا یا' یہ جو کہا گیا ہے کہ انسانوں کی طبیعت میں ملائمت ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ سختی اور صلابت کی حالت طاری کرنے سے عاری ہیں۔ یہاں ایک بار پھر ہم قرآن ہی سے رہبری حاصل کریں گے۔

و نفس وما سوھا o فالھمھا فجورھا و تقوٰھا o قد افلح من زکھٰا o و قد خاب من دسھٰا۔

''اور (خارجی کائنات سے نیچے اتر کر) خود انسانی ذات اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے۔ پھر اس کے اندر جس انداز سے اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ چاہے تو غلط روش پر چل کر اپنے اندر انتشار پیدا کرلے اور چاہے اس انتشار سے محفوظ رہ کر مستحکم سے مستحکم ہوتی چلی جائے۔ انفس و آفاق میں کارفرما یہ تمام پروگرام اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا۔ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلہ زندگی افسردہ ہو گیا۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں۔ وہ اس چقماق کی طرح ہو گیا جس میں آتش افروزی کی صلاحیت تو ہو لیکن اس کی چنگاری کی نمود نہ ہو سکے اور اس طرح وہ پتھر کا پتھر رہ جائے''۔(۷۔۱۰/۹۱)۔

اب شاید کوئی اشکال باقی نہیں رہا ہوگا کہ واقعتاً فطرت کے دو معنی ہیں۔

۱۔ موجودہ حالت۔

۲۔ وجود میں امکان کی موجودگی۔

---

[1] اچھا جہاں احسن تقویم (بہترین ساخت) کا ذکر ہے' وہیں اسفل السافلین بھی موجود ہے۔ یعنی نیک فطرت پہ جنم لینے والا اگر اپنی مرضی سے گمراہی کے پاتال میں گرنا چاہے تو اس عمل میں بھی وہ آزاد ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہلاکت کے گڑھے میں چھلانگ لگانے سے روکیں گے نہیں ہاں اسے رکنے کی افادیت اور طریق کار ضرور بتا دیں گے۔

جب ہم کسی فرد کے ظاہری احوال کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ تو ہے ہی بدفطرت‘ بدطینت تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ اس فرد پر بدی کا غلبہ ہے۔یعنی اس کی موجودہ حالت بدی پر مبنی ہے۔اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ آئندہ یہ کبھی بھی بدی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح فطرت کے معنی ’امکان‘ سے یہ مراد ہے کہ اس فرد میں بدی کو قبول کرنے کی بنیادی صلاحیت موجود ہے اور اسی طرح نیکی کو قبول کرنے کی استعداد بھی اس میں اسی قدر موجود ہے۔یعنی خیر کو جذب کرنے کا بھی مساوی امکان موجود ہے۔

یہ طے ہے کہ دنیا کے ہر شخص میں امکان کی ’مقدار‘ قدرت نے بالکل برابر رکھ دی ہے۔کسی کے ساتھ رتی برابر بھی ناانصافی نہیں کی۔اگر کسی ایک فرد کے ساتھ بھی بے عدالتی کی گئی ہے تو وہ فرد ایک لمحے میں احتساب سے مستثنیٰ ہو جائے گا۔ نہ کسی کی نیکی کا کچھ مفہوم باقی رہے گا نہ کسی کی برائی کی کچھ بھی حیثیت رہ جائے گی۔

سو ایک بار پھر وضاحت کی جاتی ہے کہ ہم نے جہاں جہاں جن و انس کی فطرتوں/طبیعتوں میں علی الترتیب سرکشی اور فرمانبرداری کا ذکر کیا ہے اس سے مراد ان کی ظاہری حالتیں ہیں۔رہا امکان کا سوال تو وہ ہر دو کو برابر ودیعت ہوا ہے خیر کا بھی اور شر کا بھی۔یعنی دونوں کو قبول کرنے کا بنیادی ملکہ ایک سا ارزاں ہوا ہے۔

قصہ مختصر‘ موجودہ مدنی الطبع انسان کا خاکی ہونا معنوی اعتبار سے ہے‘ جسمانی حوالے سے نہیں۔’’جنات‘‘ کا ناری ہونا ان کی ’باطنی‘ متشددانہ کیفیات کا اظہار ہے اس کا تجسم (Physical Body) نہیں۔مثالیں لاتعداد موجود ہیں۔

سیدنا ابوبکرؓ اپنے (ذاتی اختیار سے) ذوق و مزاج کے اعتبار سے طینی تھے۔سو اطاعت کا دلآویز نقش قبول کرلیا اور حضورﷺ کے حلیف بن گئے۔حضورﷺ کا حریف ابولہب اپنی مرضی سے ناری بن گیا‘ حریف ہی رہا۔سراپا زنیر (تیز آگ)۔ آگ نقش قبول کرنے پر کہاں آمادہ ہوتی ہے۔چنانچہ شعلوں کا یہ باپ Fire Brand نعمت ایمان سے محروم رہا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ کے خطوط

مکرمی ومحترمی۔السلام علیکم!

بلاشبہ عصر حاضر میں انسان کی جدید سائنسی کاوشوں پر عاقلانہ تدبر وتبصرہ کرتے ہوئے علامہ پرویز نے ان تھک محنت کی مگر جس طرح سرسید کی فکر کو قدامت پرستوں نے دبادیا تھا بعینہٖ یہی کچھ علامہ پرویز کے ساتھ کیا گیا۔

اگرچہ مختلف محاذوں پر قدامت پرستوں کی پسپائی ہورہی ہے تاہم ہنوز ہماری سوسائٹی ان کے چنگل سے آزاد نہیں ہوسکی۔طرفہ تماشہ یہ کہ قدامت پرستی، شخصیت پرستی کا نام اسلام رکھ کر انتہا پسند خود کو حق پہ گامزن اور جدا مؤقف رکھنے والوں کو گمراہ تصور کرتے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ ہزار سال پرانی تہذیب، سماجی روایات اور ہندومت کا دیا ہوا کلچر ڈھٹائی کے ساتھ اختیار کرنے والے ساری نسلِ انسانیت کو تاریکیوں میں واپس دھکیلنے پہ بضد ہیں۔ان کے مقفل ذہن یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ یہ دنیا پیچھے کو نہیں بلکہ آگے کو جارہی ہے۔

علامہ پرویز نے ایک جگہ پہ بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ جو لوگ آج کے دور کو نہیں سمجھتے وہ اس دور کے تقاضوں کو کیا سمجھیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ان سے انسان کے حقوق اور عورت کے مرتبہ کا تعین نہیں ہوسکتا اور نتیجتاً وہ ذات پات اور عورت کی کمتر حیثیت کے قائل رہتے ہوئے مساوات کا درس دیتے رہتے ہیں۔اس طرح کے فکری تضاد کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔مگر مسلمان سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

قدامت پرست ناقص روایات، جاہلانہ رسومات، منبع تضادات مروجہ توہمات، غیر سائنسی تشریحات کے مسترد کئے جانے کو راہِ حق سے انحراف، نوجوان نسل کی گمراہی اور ابلیس کی کارستانی تصور کرتے ہیں۔

طلوع اسلام کے لٹریچر میں اکثر علامہ اقبال اور مسٹر جناح سے عقیدت کی اس قدر تشہیر کی جاتی ہے کہ اس سے پروپیگنڈا کا اظہار اور شخصیت پرستی کی بو آتی ہے۔اندھی تقلید اور شخصیت پرستی خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، یکساں طور پہ مسترد کئے

جانے کے قابل ہے۔

اس سلسلہ میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔

سیاسی شخصیت پرستی نے مسلمانوں کو حقوق انسانی کے شعور، انسان کا مطالعہ اور تاریخ پر غیر متعصّبانہ، غیر جانبدارانہ غور و فکر سے محروم رکھا ہے۔ گذشتہ سو سال کی برصغیر کی سیاسی تاریخ اور نتائج سب کے سامنے ہیں۔ وقت نے بہت سے مخفی گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔

اقبال کی فکر کا جو دھارا تحریک طلوع اسلام سے ملتا ہے وہ The Reconstruction of Religious Thought in Islam والا ہے۔

اقبال کی اس طرزِ فکر نے معاشرہ میں کس قدر شرف قبولیت حاصل کیا ہے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی کلیات اقبال تو موجود ہے مگر خطبات اقبال کا کسی کو علم نہیں۔

علامہ پرویز کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں طلوع اسلام مشن کا ایک اصول سامنے آتا ہے کہ پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر اندھی تقلید کی بجائے ہر موضوع پر غیر جانبداری سے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اور نتائج کی سائنسی تعبیر کرتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ، تعقل اور تدبر پہ مبنی درست رائے اختیار کی جائے۔

آخر میں گزارش ہے کہ ''ادارہ طلوع اسلام'' کی موجودہ سرگرمیوں سے آگاہ کریں اور فہرست کتب بھی ارسال فرمائیں شکریہ۔

والسلام، خیر اندیش

عبدالماجد،

E-92، RVC، کالونی رائٹ بنک،

تربیلا، پوسٹ کوڈ 23470،

ضلع صوابی، (صوبہ سرحد)

Email:mjromani@yahoo.com

محترم عبدالماجد صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

تفصیلی خط لکھنے کا شکریہ۔ ہمیں آپ کی تمام باتوں سے اتفاق ہے۔ شخصیت پرستی کے حوالے سے بھی آپ کے تاثرات بجا ہیں۔ علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح علیہم الرحمتہ کے حوالے سے ہم صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ طلوع اسلام نے علامہ اقبال پر تنقید بھی کی ہے۔ خاص طور پر ان کے ابتدائے عمر کے وحدت الوجودی میلان کو موضوع نقد بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں ''تصوف کی حقیقت''، مطبوعہ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور۔ اسی طرح قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے ایک بات کا ذکر اس ضمن میں ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے دوقومی نظریے کے دفاع اور حصول پاکستان کی تحریک میں

نمایاں اور اہم خدمات کے صلہ میں ''طلوع اسلام'' کو مملکت پاکستان کے خرچہ پر چلانے کی پیش کش کی جسے پرویز علیہ الرحمتہ نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر ''طلوع اسلام'' سرکاری پرچہ بن گیا تو یہ قائداعظم پر تنقید کیسے کر سکے گا۔

علاوہ ازیں ان دو عظیم شخصیات (علامہ اقبال اور محمد علی جناح) کے مسلمانان برصغیر پر بالخصوص اور مسلم امہ پر بالعموم جو اثرات یا احسانات ہیں ان سے قطع نظر کرنا اور ان کی خدمات کا تذکرہ اچھے الفاظ میں نہ کرنا قرینِ انصاف نہ ہوگا۔

فہرستِ کتب روانۂ خدمت کر دی گئی ہے۔

خیر اندیش

محمد سلیم اختر

☆☆☆

محترم المقام محمد سلیم اختر صاحب۔

دعا و سلام۔

کمترین راقم سطور کا ایک مضمون بعنوان ''مفسرین کرام کی ایک لغزش کے انسانیت سوز نتائج'' بابت اگست ۲۰۰۵ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں سورہ النساء کی آیات ۱۵'۱۶ کی تشریح کر کے یہ عرض کیا گیا تھا کہ ان آیات کا زنا کے فعل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان آیات کی وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ حدود آرڈیننس کا سارا دارومدار ان آیات کی غلط توجیہہ پر ہے اور اس کا عملاً نتیجہ یہ ہے کہ اس Ordinance کی زد میں آ کر ہزاروں خواتین بے جرم و خطا قید خانوں میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور ان کی اس مصیبت کی وجہ اس آیت کی غلط تفسیر ہے۔ میں نے ان آیات میں فاحشۃ کا ترجمہ سحاقت کیا ہے۔ اکتوبر کے طلوع اسلام میں میرے محترم عزیز کرنل محمد ایوب خان صاحب کا ایک گرامی نامہ طبع ہوا ہے۔ جس میں آنجناب نے میری اس بات سے تو اتفاق فرمایا ہے کہ ان آیات میں فاحشۃ سے مراد زنا نہیں ہے اور اصل مقصود بھی میرا یہی تھا تا کہ اس آرڈیننس کی زمین ہی اس کے نیچے سے نکل جائے اور اس کی اساس ہی غلط ثابت ہو جائے' اس سے محترم کرنل صاحب کو اتفاق ہے البتہ انہوں نے فاحشۃ کے معنے بے حیائی قرار دیئے ہیں۔ میں نے جس وجہ سے فاحشہ کا مطلب سحاقت کیا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں' جو پیش خدمت عالی ہیں۔

قرآن کریم میں مندرجہ ذیل تین آیات میں فاحشہ کو لواطت کے معنے میں استعمال کیا ہے۔

(۱) ولوطاً اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشۃ وانتم تبصرون۔ ائنکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء (۲۷/۵۵)۔ اور لوط کو یاد کرو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم دیکھ بھال کر ایسی بے حیائی کرتے ہو' کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کے پاس آتے ہیں۔

(۲) ولوطاً اذ قال یقومہٖ اتاتون الفاحشة ما بیقکم بھا من احد من العالمین ائنکم کتاتون الرجال شھوةً من دون النساء (۸۰/۷)۔اورلوط کوہم نے بھیجاجب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بدکاری (اغلام) کرتے ہوکہ تم سے پہلے ساری خدائی میں کسی نے ایسی بدکاری نہیں کی تھی تم عورتوں کوچھوڑ کرشہوت پرستی میں مردوں کی طرف مائل ہوتے ہو۔

ان دونوں آیات نے بے حیائی کی وضاحت من دون النساء کے الفاظ لا کرلواطت سے کردی۔ فاحشتہ کا ترجمہ بے شک آپ بے حیائی کردیں لیکن اس کی وضاحت اوراس کاعملی مفہوم لواطت ہی ہے۔

(۳) ولوطاً اذ قال لقومہٖ انکم لتاتون الفاحشة ما سبقکم بھا من احد من العلمین ائنکم لتاتون الرجال (۲۹/۲۸)۔اورلوط جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ عجیب بے حیائی کا کام کرتے ہوکہ تم سے پہلے ساری خدائی کے لوگوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔تم لوگ عورتوں کوچھوڑ کر مردوں کی طرف گرتے ہو۔

آیت نمبر۱۶صرف مردوں کے متعلق ہے'اس میں عورت شریک نہیں ہوسکتی کیونکہ والذان مذکر کاصیغہ ہےاور منکم نے اوروضاحت کردی کہ یہ دونوں مرد ہیں۔آیت نمبر۱۶میں جوضمیر یاتینھا میں آتی ہے'اس کا مرجع فاحشہ ہےاوردومردآپس میں جوفاحشہ کریں گےوہ مندرجہ بالاتین آیات کی رو سےلواطت ہی ہوسکتی ہے۔آیت مجیدہ۱۶میں آمدہ ''ھا'' کا ترجمہ''وہی کام' 'یہ بات واضح کر رہاہے' کہ آیت نمبر۱۵میں عورتوں کا بھی وہی کام ہے جوآیت نمبر۱۶میں مردوں کا تھا۔یعنی ہم جنس پرستی۔جرم کی نوعیت ایک ہی ہے۔لیکن سزا' دونوں اصناف کے لئے' ان کے وظائف حیات کی وجہ سےمختلف ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کوتمام جرائم کا احاطہ کرنا ہے'اس کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ایک مرداورایک عورت یہ زنا ہے۔دونوں مرد یا دونوں عورتیں یہ ہم جنس پرستی لواطت یا سحاقت ہے۔قرآن کریم کو ان تینوں جرائم کو Cover کرنا تھاچنانچہ الزانیة والزانی ۲/۲۴'زنا کار عورت اورزنا کارمرد یہ فعل زنا کے ساتھ مخصوص ہے جوایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ان کے اشتراک سے رونما ہوتا ہے۔والتی یاتین الفاحشة من النساء کم ۴/۱۵' جوعورتیں تم میں سے فاحشہ کی مرتکب ہوں سحاقت کے لئے مخصوص ہے جو دوعورتوں کے درمیان رونما ہوتا ہے اور آیت والذان یاتینھا منکم فاٰذوھما ۴/۱۶۔اور جو دومردتم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو انہیں اذیت دوٗ لواطت کے ساتھ مخصوص ہے۔جس میں دومرد ملوث ہوتے

ہیں۔ اس طرح عزت و آبرو، نیک چلنی اور عفاف سے متعلق سزا مکمل ہو جاتی ہے۔ ورنہ اس مقام کے علاوہ ہم جنس پرستی کی سزا کا قرآن کریم میں کہیں اور ذکر نہیں ہے۔

میں قرآن کریم کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میں نے یہ مفہوم غور کرنے کے بعد لکھا ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ مفہوم مجھے کسی اور تفسیر میں نہیں ملا۔ اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ طلوع اسلام کے حلقے میں ایسے افراد موجود ہیں جن کی نگاہ قرآن پر ہے اور وہ غلط مضامین پر گرفت کر سکتے ہیں۔

والسلام مع الاکرام

خواجہ ازہر عباس، کراچی

مکرمی خواجہ صاحب

سلام ورحمت

آپ کا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ سامنے آ گیا ہے۔ جبکہ اس سے قبل سورہ النساء کی آیات ۱۵ اور ۱۶ کا مفہوم محترم پرویز صاحب کے مفہوم القرآن سے بھی پیش کیا جا چکا ہے اور اس ضمن میں محترم کرنل ڈاکٹر ایوب صاحب کا ترجمہ و حواشی بھی چھپ چکے ہیں۔ اب وقت ہے کہ اس علمی بحث کو یہیں پر ختم کر دیا جائے۔

خیر اندیش

محمد سلیم اختر